قرآن کالج کے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے

ایک اہم اطلاع

○ پاکستان کے ایک صنعتی ادارے اور ایک تجارتی ادارے نے قرآن کالج سے بی اے پاس کرنے والے طلبہ کو اس بنیاد پر کہ ان طلبہ نے دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کی ہے' ملازمت میں ترجیح دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

○ مذکورہ صنعتی ادارے کی فیکٹری گدون امیزئی صوبہ سرحد میں اور ہیڈ آفس کراچی میں ہے جبکہ تجارتی ادارے کا ہیڈ آفس نیویارک' امریکہ میں اور برانچ آفس کراچی میں ہے۔

○ ان اداروں نے اضافی سہولت یہ فراہم کی ہے کہ وہ قرآن کالج کے فارغ التحصیل طلبہ کا انٹرویو لینے کے لئے لاہور میں خصوصی انتظام کریں گے۔

○ ملازمت کے خواہش مند تمام فارغ التحصیل طلباء کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنی درخواست ۱۶ دسمبر ۹۳ء تک مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے ناظم اعلیٰ جناب سراج الحق سید صاحب کو ارسال کر دیں۔ درخواست میں اپنا موجودہ پتہ اور رابطے کے لئے ٹیلی فون نمبر ضرور درج کریں تاکہ انٹرویو کی تاریخ سے انہیں مطلع کیا جا سکے۔

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۲ | جمادی الاخریٰ ۱۴۱۴ھ دسمبر ۱۹۹۳ء | شمارہ ۱۲

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور۔ ۱۴ فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بکری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون ۴۰ روپے فی شمارہ ۴ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف اول

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے زیر ادارت "حکمت قرآن" کا پہلا باقاعدہ شمارہ مئی ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا' اور یہ تحریک رجوع الی القرآن کا نقیب اور مرکزی انجمن خدام القرآن کا آرگن قرار پایا۔ اُس وقت فی شمارہ قیمت ۔/۲ روپے اور سالانہ زر تعاون ۔/۲۰ روپے طے پایا جبکہ ان دنوں یہ پرچہ ۴۸ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے بعد وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ پرچے کی قیمت میں اضافہ اور صفحات کی تعداد میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ مہنگائی کا گراف چونکہ مسلسل اوپر کی جانب بڑھ رہا ہے' کاغذ کی قیمت اور طباعتی اخراجات میں مسلسل اضافہ کہیں سنبھلنے ہی نہیں دیتا لہٰذا پرچے کی قیمت میں بتدریج اضافہ بھی ناگزیر تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۷ء کے اوائل میں پرچے کی قیمت ۔/۲ سے بڑھ کر ۔/۴ روپے ہو چکی تھی اور سالانہ زر تعاون بھی ۔/۲۰ سے ۔/۴۰ تک جا پہنچا تھا' تاہم پرچے کے صفحات میں بھی کسی قدر اضافہ ہو چکا تھا اور پرچہ ۴۸ کی بجائے ۶۴ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے بعد مسلسل سات برس پرچے کی قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا' چنانچہ دسمبر ۹۳ء تک پرچہ ۔/۴ ہی روپے میں فروخت کیا جاتا رہا حالانکہ اس دوران مہنگائی کا سیلاب ایک لمحے کے لئے بھی نہیں تھما اور کاروبار زندگی سے متعلق کوئی بھی شے اس کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکی۔ مہنگائی کا تمام تر بوجھ ادارے نے خود برداشت کیا۔ لیکن یہ بوجھ اب چونکہ ناقابل برداشت حد تک بڑھ چکا ہے لہٰذا آئندہ سے پرچے کی قیمت میں کسی قدر اضافہ کیا جا رہا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس پوری صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے قارئین خوش دلی کے ساتھ پرچے کی قیمت میں اضافے کو قبول کریں گے۔ جنوری ۹۴ء سے فی شمارہ قیمت چار روپے سے بڑھا کر چھ روپے طے کی گئی ہے اور سالانہ زر تعاون چالیس سے بڑھا کر ساٹھ روپے کر دیا گیا ہے۔ محکمہ ڈاک نے بیرون پاکستان ڈاک خرچ میں چونکہ گذشتہ دنوں غیر معمولی اضافہ کیا ہے لہٰذا بیرون پاکستان کے لئے زر تعاون میں قدرے زیادہ اضافہ کرنا پڑا ہے۔ اس کی پوری تفصیل اندرونی سرورق کے صفحہ ۳ پر درج کر دی گئی ہے۔ ○○

مطالعۂ قرآن حکیم

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۂ ھُود

آیات ۹-۱۱

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَۃً ثُمَّ نَزَعْنٰھَا مِنْہُ اِنَّہٗ لَیَئُوْسٌ
کَفُوْرٌ ○ وَلَئِنْ اَذَقْنٰہُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْہُ لَیَقُوْلَنَّ ذَھَبَ
السَّیِّاٰتُ عَنِّیْ اِنَّہٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ کَبِیْرٌ ○

"اور اگر ہم انسان کو اپنی کسی رحمت سے نوازتے ہیں اور پھر اُسے اُس سے سلب کر لیتے ہیں تو وہ نہایت مایوس ہو جاتا ہے اور حد درجہ ناشکرا بھی! اور اگر کسی مصیبت کے بعد جس میں وہ مبتلا ہوا ہو، اسے اپنی نعمتوں سے نوازتے ہیں تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میری ساری مصیبتیں رفع ہو گئیں اور وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور شیخی بگھارنے لگتا ہے۔ اِس سے مستثنیٰ اگر ہیں تو صرف وہ جو صبر کرنے والے اور نیک عمل کرنے والے ہیں۔ چنانچہ ان ہی کے لیے بخشش بھی ہے اور بڑا اجر بھی!"

اِن آیاتِ مبارکہ میں اُن ظاہر بین لوگوں کی کیفیات بیان ہوئی ہیں جو ع "نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!" کے مصداق نہ اپنے عزیز و قدیر خالق و مالک اور رؤف و رحیم پروردگار و پالنہار پر ایمان رکھتے ہیں، نہ سفرِ حیات کی اصل منزل یعنی آخرت کا علم رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت اُن کی نگاہوں سے اوجھل رہ جاتی ہے کہ موجودہ زندگی یا حیاتِ دُنیوی تو اُن کے طویل سفرِ حیات کا ایک مختصر اور حقیر سا وقفہ ہے جس کی اصل غرض و غایت ہی تکلیف و ابتلاء اور آزمائش و امتحان ہے، بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ　　　جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اور

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

نتیجۃً وہ اس زندگی ہی کو کل زندگی سمجھ لیتے ہیں اور ان کے نزدیک یہاں کی آسودگی و آرائش خوش بختی کی دلیلِ قاطع بن جاتی ہے اور یہاں کی محرومی یا تکلیف بدنصیبی کا اٹل ثبوت۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حیاتِ دُنیوی کے دوران بدلتے ہوئے احوال اور واقعات و حوادث کی اُونچ نیچ سے اُن کے قلوب اذہان شدت کے ساتھ متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر کبھی آرام و آسائش سے بہرہ مند رہنے کے بعد کسی درجے میں محرومی کا سامنا ہوتا ہے تو ان پر مایوسی کا غلبہ ہو جاتا ہے اور اُن کی کمرِ ہمت ٹوٹ کر رہ جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی وہ سابقہ نعمتوں کو بھی بالکل بھول جاتے ہیں اور ایسے ناشکرے بن جاتے ہیں جیسے انہیں کبھی کوئی نعمت ملی ہی نہ ہو اور اس کے برعکس اگر کبھی تنگیوں یا تکلیفوں سے دوچار رہنے کے بعد راحت و مسرت سے کنار ہوتے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور اکڑنے اور اترانے لگتے ہیں۔ گویا کہ حالات کی یہ تبدیلی اُن کی محنت و مشقت کا ثمرہ اور اُن کے حُسنِ تدبیر کا نتیجہ ہے۔ ساتھ ہی وہ سابقہ تکلیف دہ حالات کا خیال بھی دل سے نکال دیتے ہیں اور بزعمِ خویش یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اُن کے سب دلدر مستقل طور پر دُور ہو گئے اور اب کسی مصیبت کے لوٹ آنے کا کوئی امکان نہیں!

قرآنِ حکیم میں یہ مضمون بتکرار و اعادہ وارد ہوا ہے۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا:

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا۔ (آیت: ۸۳)

(ترجمہ) اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اس کو نعمتوں سے نوازتے ہیں تو (ہم سے) دُگردانی کرتا ہے اور پہلو موڑ لیتا ہے اور جب کوئی تکلیف اُسے لاحق ہوتی ہے تو مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

اور سورۃ الشوریٰ میں فرمایا:

وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ۔

(ترجمہ) اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو اس پر خوشی سے پھولے نہیں سماتا۔ اور اگر کبھی اپنے ہاتھوں ہی کے کرتوتوں کے باعث کوئی مصیبت انہیں آدبوچتی ہے تو انسان سخت ناشکرا بن جاتا ہے!

اِن آیات کی ہم مضمون اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں واضح کیا گیا ہے کہ انسان کا یہ طرزِ عمل براہِ راست

نتیجہ ہے اس کے حقیقتِ نفس الامری سے ذہنی و قلبی بُعد کا جس کے باعث اُن کی نگاہیں ظاہر ہی میں اُلجھ کر رہ جاتی ہیں' بلفوائے الفاظِ قرآنی: "یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" یعنی یہ لوگ آخرت سے تو بے خبر ہیں ہی' اس حیاتِ دُنیوی کے بھی صرف ظاہر سے واقف ہیں' اِس کی بھی اصل حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں! یہ مضمون اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے سورۃ الفجر کی حسبِ ذیل آیات میں:

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝ كَلَّا (آیات ۱۵-۱۷)

(ترجمہ) "مگر انسان کا حال یہ ہے کہ جب اُس کا رب اُسے آزمائش میں مبتلا کرتا ہے' چنانچہ اسے عزّت بھی دیتا ہے اور نعمتوں سے بھی نوازتا ہے' تو وہ یہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزّت بخشی۔ اور جب وہ اسے آزماتا ہے (دوسری طرح) چنانچہ اس پر رزق تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں!"

یعنی اگرچہ وہ اپنی عزّت و ذلّت کو اللہ ہی کی جانب منسوب کر رہا ہے' اس اعتبار سے مشرک ہرگز نہیں ہے کہ دولت مندی اور آرام و آسائش کو کسی لکشمی دیوی کی نگاہِ کرم کا ثمرہ سمجھتا ہو' اور رزق کی تنگی یا کسی اور مصیبت یا تکلیف کو کسی دوسری دیوی یا دیوتا کی ناراضگی کا نتیجہ۔ تاہم اس "ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا" سے رستگاری کے باوجود اس کی نگاہ پر ابھی ایک پردہ پڑا ہوا ہے' اور وہ یہ کہ وہ یہاں کی ظاہری اور عارضی اور صرف آزمائشی عزّت کو اصل عزّت سمجھ بیٹھا ہے اور یہاں کی فوری اور وقتی اور محض امتحانی سختی کو موجبِ ذلّت گردانتا ہے' حالانکہ یہ دُنیا صرف دارالامتحان ہے۔ یہاں اللہ کبھی دے کر آزماتا ہے کہ انسان اللہ کا شکر کرتا ہے یا غرور و تکبّر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور مارے خوشی کے پھولا نہیں سماتا۔ اور کبھی کچھ چھین کر آزماتا ہے کہ انسان صبر کرتا ہے یا جزع فزع کرتا ہے اور بالکل مایوس اور ناامید ہو کر بیٹھ رہتا ہے۔

آیاتِ زیرِ بحث میں دُنیوی رنج و غم اور راحت و مسرت کے مواقع پر ظاہر بین دنیا پرستوں کے احوال و کیفیات کے اظہار کے لیے نہایت فصیح و بلیغ الفاظ استعمال ہوئے ہیں یعنی پہلی صورت میں "یَئُوْس" اور "کَفُوْر"۔ اور دوسری حالت میں "فَرِح" اور "فَخُوْر"۔ "یَئُوْس" اور "کَفُوْر" دونوں "فَعُوْل" کے وزن پر مبالغے کے لیے آتے ہیں یعنی حد درجہ مایوس اور نہایت ناشکرا۔ جبکہ "فَرِح" کا مفہوم ہے خوشی سے پھٹ پڑنا یا پھولے نہ سمانا اور "فَخُوْر" پھر "فَعُوْل" ہی کے وزن پر اسم مبالغہ ہے یعنی حد درجہ شیخی خور اور اپنے آپ پر اترانے والا۔

اس کے بالکل برعکس کیفیت ہے مؤمنین عارفین کی' جو دُنیا کے حالات کے ردّ و بدل اور حوادث

واقعات کی اُونچ نیچ سے زیادہ متاثر نہیں ہوتے، بلکہ ہر حال میں صبر و شکر کی روش پر قائم رہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس حیاتِ دُنیوی کے دوران خواہ راحت و مسرت کا معاملہ ہو خواہ رنج و کلفت کا، ایک تو دونوں ہی عارضی بھی ہیں اور آنی و فانی بھی اور دوسرے دونوں اس اعتبار سے یکساں ہیں کہ دونوں ہی کی اصل علت و غایت امتحان و آزمائش ہے۔ چنانچہ انہیں اگر کچھ ملتا ہے تو وہ اپنے رب کے شکر کے ساتھ اس کو قبول کرتے ہیں اور اتراتے اور اکڑتے نہیں! اور اگر کبھی کچھ چھن جاتا ہے یا ہاتھ سے جاتا رہتا ہے تو صبر کرتے ہیں، اور نہ مایوس ہوتے ہیں نہ بے چین و مضطرب! گویا ان کی کیفیت وہ ہوتی ہے جو سورۃ الحدید کے ان الفاظ میں بیان ہوئی کہ:

لِکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰىکُمۡ۔ (آیت ۲۳)

(ترجمہ) "تاکہ تم مایوس نہ ہو جایا کرو اس پر جو تم سے چھوٹ جائے یا چھن جائے، اور اترایا نہ کرو اس پر جو تمہارا رب تمہیں عطا فرمائے"۔

شکر اور صبر میں سے بھی چونکہ صبر کا درجہ بلند تر ہے، اس لیے کہ شکر کے ساتھ تو قرآن میں صرف یہ الفاظ آئے ہیں کہ: "لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ" یعنی "اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور دوں گا"! اور صابرین کو اپنی معیتِ خصوصی کی بشارت سنائی گئی بلفظوائے الفاظِ قرآنی: "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ" یعنی "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"! لہٰذا آیات زیرِ بحث میں صرف صبر کا ذکر کیا گیا، گویا اس تکمیلی مرتبے کے ذکر کے ساتھ شکر جو اساسی بنیادی وصف ہے وہ آپ سے آپ مندرج ہو گیا۔

اپنے عام اور مستقل قاعدے کے تحت قرآن نے یہاں صبر کے ساتھ عملِ صالح کا ذکر بھی کر دیا، تاکہ واضح ہو جائے کہ اہلِ ایمان اور عارفین باللہ کا صبر کوئی سلبی یا منفی قدر نہیں ہے بلکہ ایک مثبت جذبہ ہے جس کی کوکھ سے عملِ صالح جنم لیتا ہے۔ وہ عملِ صالح جو تہذیب و تمدن کا انداز بدلتا اور تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑتا ہے، اور بقول علامہ اقبال مرحوم "وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل" کی صورت اختیار کرتا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ یہی لوگ ہیں اپنے رب کی مغفرت کے حقدار بھی اور اجرِ کبیر کے مستحق بھی! ۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجۡعَلۡنَا مِنۡھُمۡ!

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝

حضرت سلطان المشائخؒ کی تفسیرِ قرآن کریم پر گہری نظر

مولانا اخلاق حسین قاسمی

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء علیہ الرحمۃ کی نظر جس طرح احادیثِ نبویؐ پر نہایت وسیع اور محققانہ تھی اسی طرح قرآن کریم کی تفسیر پر بھی آپ کو بڑا عبور حاصل تھا اور افادات کے وقت قرآنی لطائف و معارف آپ کے ذہن میں مستحضر رہتے تھے۔ قرآن کریم اور احادیث نبوی ﷺ اسلام کے دو بنیادی اور اصولی مآخذ ہیں اور ان میں تمام دینی علوم تصریح کے ساتھ یا اشارات میں موجود ہیں۔ ایک عالم اگر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں صاحب نظر ہے تو وہ جملہ علوم دینی میں صاحب نظر تسلیم کیا جائے گا۔ فرق یہ ہے کہ کسی عالم کا خاص موضوع قوانین شریعت ہیں تو وہ فقیہ ہے اور اس کی پوری توجہ اسی موضوع پر ہوتی ہے' دوسرے موضوعات اس کی دلچسپی کا مرکز نہیں ہوتے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قرآنی علوم کو پانچ بنیادی علوم پر تقسیم کیا ہے

(۱) علم الاحکام ---- یہ علم فقہاء کا خاص موضوع ہے۔

(۲) علم المناظرہ --- یعنی باطل قوتوں کے عقائد کی تردید - یہ علم متکلمین اسلام کا موضوع ہے۔

(۳) علم تذکیر بآلاء اللہ --- یعنی انعامات الٰہی کے ذریعہ نصیحت کرنا۔

(۴) علم تذکیر بایام اللہ --- یعنی حوادث تاریخی کے ذریعہ وعظ و نصیحت کرنا۔

(۵) تذکیر بالموت -- یعنی موت کے بعد واقع ہونے والے حوادث کے ذریعہ وعظ و نصیحت کرنا۔

آخری تینوں علوم واعظوں اور معلمین اخلاق کا موضوع ہیں (الفوز الکبیر ۴) اس تقسیم کا تعلق عام معلومات سے نہیں ہے بلکہ خاص دلچسپی اور خاص مہارت سے ہے۔

اس تقسیم کے لحاظ سے شیخ علیہ الرحمہ علم المناظرہ کے منفی پہلو کے علاوہ پانچوں علوم پر حاوی نظر آتے ہیں۔ ردو کد اور تنقید چونکہ تصوف کی روح سے مناسبت نہیں رکھتی اس لئے اس کا اثر شیخ ؒ کے افادات میں محسوس نہیں ہوتا۔ علم الاحکام کے تعلق سے عبادت' طہارت' صدقہ اور مہر کی بحثیں --- علم المناظرہ کے مثبت پہلو کے تعلق سے ایمان باللہ' ایمان بالغیب اور توبہ پر گفتگو --- علم التذکیر کے تعلق سے ترغیب و ترہیب --- اور خوف و رجاء پر مشتمل حکایات کے ذریعہ تزکیۂ اخلاق و عادات کا حصہ --- جو ملفوظات میں غالب نظر آتا ہے۔ نحو و لغت جو علوم آلیہ کہلاتے ہیں' ان پر بھی شیخ ؒ کی گفتگو موجود ہے' جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

تفسیر کشاف اور تفسیر بیضاوی کا دور

تفاسیر میں وہ دور علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی کی تفاسیر کا تھا۔ فوائد الفواد میں بیضاوی کو تفسیر ناصری کہا گیا ہے' جو اس کے مصنف کے نام کی طرف منسوب ہے۔

علامہ جار اللہ زمخشری

علامہ جار اللہ محمود ابن عمر زمخشری (ولادت ۴۶۷ھ) کی تفسیر کشاف علامہ ابن خلدون کی رائے کے مطابق ایک بہترین تفسیر ہے مگر مصنف نے اس میں اپنے فاسد نظریات کی پرزور وکالت کی ہے۔ کشاف کا مطالعہ کرنے والا اگر اہل سنت کے عقائد سے واقف ہو کر اس کا مطالعہ کرے تو اس کا مطالعہ ضرر رساں نہیں۔ فقہ کے مسلک میں یہ حنفی تھے۔ (مقدمہ ابن خلدون ۴۹۱)

علامہ تاج الدین سبکی نے زمخشری کو حضرات انبیاء اور صالحین امت کی شان میں بے ادبی کرنے والا لکھا ہے۔ وہ اپنے والد علامہ تقی الدین سبکی ؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے "زمخشری نے رسول اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے' اس لئے میں نے اس کتاب کی تدریس حضور ﷺ سے حیا کرتے ہوئے بند کردی"۔ (النماذج الخیریہ ۳۱۰)

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مجلس میں کشاف سے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کی نحوی ترکیب پر تقریر فرمائی اور اپنے شیخ رشید خواجہ حسن بصری ؒ کی قراءت پر حضرت ابراہیم نخعی ؒ کی قراءت کو ترجیح دی اور یہ شیخ ؒ کے علمی ذوق کا نتیجہ تھا۔ اور پھر آخر میں اَلْحَمْد کی دال اور اللّٰہ کے

لام سے ایک صوفیانہ نکتہ بیان فرمایا۔ یہ شیخ ؒ کا اصلی ذوق تھا۔ پھر علامہ زمخشری کی علمی جلالت کا اعتراف کرکے اسکے معتزلانہ عقائد کی مذمت فرمائی اور شیخ صدر الدین ؒ کے حوالہ سے فرمایا کہ انہوں نے ایک شخص کو خواب میں دیکھا کہ اسے زنجیر میں باندھ کر لے جایا جارہا ہے۔ انہوں نے پوچھا یہ کون ہے؟ انہیں بتایا گیا کہ یہ نحو مفصل لکھنے والا زمخشری ہے۔ (جلد ۳' مجلس ۱۱' ص ۵۶۱)--- زمخشری کے اعتزال کے باوجود اکابر صوفیہ اس کی تفسیر کی علمی عظمت کے سبب اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے۔ قاضی حمید الدین صاحب ناگوری ؒ کے پاس تفسیر کشاف آٹھ جلدوں میں مجلد رکھی ہوئی تھی۔

خواجہ حسن فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے دیکھا کہ شیخ علیہ الرحمہ کے سامنے تفسیر ناصری (بیضاوی) رکھی ہوئی ہے۔ آپ نے اس تفسیر کے مصنف قاضی ناصر الدین ؒ کی ایک کرامت بیان فرماکر اس تفسیر کی عظمت و مقبولیت پر روشنی ڈالی۔ (جلد ۲' مجلس ۱۸' ص ۳۸۷)

اہل علم کی اس رائے کے بعد حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے شیخ صدر الدین ؒ کے حوالہ سے جو خواب بیان کیا ہے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا' لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ خود شیخ ؒ نے اپنی مبارک زبان سے زمخشری پر جہنمی ہونے کا حکم نہیں لگایا۔ یہ ایک طرف تصوف کے آداب کا تقاضا تھا اور دوسری طرف فقہی اصولوں کی رعایت تھی۔ فقہاء کا متفقہ اصول یہ ہے کہ جس غلط قول کی تاویل صحیح ہوسکتی ہے اور تاویل کرکے اس میں صحیح مفہوم کا پہلو نکالا جاسکتا ہے اس قول پر کفر و ضلالت کا فتویٰ نہیں لگایا جاسکتا۔ کافر و جہنمی قرار دینے کے لئے ناقابل تاویل (کفر بواح) فاسد نظریہ ہونا چاہئے۔ خواب' خواب ہی ہے اور مذکورہ خواب کی یہ تعبیر بیان کی جاسکتی ہے کہ زمخشری کے فاسد نظریات کی طرف اس خواب میں اشارہ کیا گیا ہے' ورنہ فرقہ معتزلہ پر علماء اہل سنت کی طرف سے جہنمی اور کافر ہونے کا فتویٰ نہیں لگایا گیا۔

امام عبداللہ ناصر الدین بیضاوی ؒ

ان کا لقب ناصر الدین ہے اور بیضاوی نسبت ہے۔ شافعی المسلک تھے۔ آذربائیجانی علاقہ کے عظیم ترین عالم اور زاہد و عابد شمار کئے جاتے تھے۔ ان کی ولادت ۶۸۵ھ کی ہے۔ ان کی تفسیر کو علوم حدیث' بلاغت' نحو' اور درایت کے اصولوں پر مشتمل نہایت اعلیٰ تفسیر کہا گیا ہے۔

(جاری ہے)

اِنَّ الْبِدْعَۃَ تَھْدِیْ اِلَی الْمَعْصِیَۃِ

تحریر: محمد یونس جنجوعہ

بدعت عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا لغوی معنی نئی اور انوکھی چیز ہے۔ دین اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ کام بدعت کہلاتا ہے جو بظاہر کتنا ہی اچھا دکھائی دیتا ہو مگر نہ تو اس کا وجود عہدِ رسالت مآب ﷺ میں اور نہ ہی خلافت راشدہ میں ملتا ہو بلکہ وہ سراسر بعد کی ایجاد ہو۔ اور اگرچہ اس کو دین کا حصہ نہ سمجھا جائے مگر اس پر عمل اس اہتمام ولزوم کے ساتھ کیا جائے کہ اس کے ترک کرنے کو برا سمجھا جائے۔

دین اسلام میں بدعت انتہائی قابل نفرت چیز ہے۔ اور وہ اس لئے کہ اللہ نے امت محمد ﷺ کے لئے اسلام بحیثیت دین پسند کیا ہے۔ اور اس دین کو مکمل بھی کر دیا ہے۔ گویا دین اسلام جس سادگی کے ساتھ رسول پاک ﷺ نے امت کے سپرد کیا وہ سادگی اس میں قائم رہنا چاہئے۔ اس طرح دین خالص رہے گا اور افراد امت کے لئے اس پر عمل میں آسانی رہے گی اور یہی آسانی مطلوب و مقصود ہے۔ آنحضرت ﷺ کی وفات سے تقریباً تین ماہ قبل حجۃ الوداع کے موقعہ پر سورۃ المائدہ کی وہ مشہور آیت نازل ہوئی جس میں تکمیل دین اور اتمام نعمت کا اعلان کر کے بدعت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط

ترجمہ: "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔"

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دین اسلام کے سوا جو کوئی دوسرا دین اختیار کرے وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا:

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَ ھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ○ (سورۂ آل عمران:۸۵)

ترجمہ: "اور جو شخص اس دین اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرنا چاہے تو وہ ہرگز اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں ایسا شخص ناکام و نامراد رہے گا۔"

بس خدا کا پسندیدہ دین اسلام ہے جو انسانوں کے پاس مکمل حالت میں محفوظ ہے۔ پس بدعت کتنی بھی خوش نما ہو وہ اسلام میں داخل نہیں ہو سکتی کیونکہ اس طرح دین اسلام میں نقص ماننا پڑے گا جسے بدعت نے دور کیا' اور یہ محال ہے۔ اس لئے کہ دین کی تکمیل ہو چکی اور اب دین میں کسی طرح کی زیادتی بھی برداشت نہیں کی جا سکتی۔

دین نام ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا اور بس۔ اللہ کی کتاب اپنی اصلی حالت میں ہمارے پاس موجود ہے اور اسوۂ حسنہ مستند ترین ذرائع سے ہمارے پاس پہنچ چکا ہے اور یہی مکمل اور کامل دین ہے۔ جو کچھ خالق کائنات کی پسندیدہ چیزیں ہیں ان کا ذکر قرآن پاک میں آگیا اور نبی اکرم ﷺ نے ان پر عمل کر کے دکھادیا۔ آپ کے اس عملی نمونہ کی تصدیق بھی اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کردی کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب)

ترجمہ: "بیشک رسول اللہ (ﷺ) کی زندگی میں تمہارے لئے اچھا نمونہ موجود ہے۔"

پس اب آپ ہی کا عمل اصل دین ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو حکم دیا کہ اگر کسی معاملہ میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹو:

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (سورۃ النساء :۵۹)

ترجمہ: "پس اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ۔"

گویا دین کے معاملے میں اللہ کے رسول ﷺ کا فیصلہ حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے جس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا ہی اسلام ہے۔ چہ جائیکہ کسی بات کے بارے میں یہ کہا جائے کہ فلاں صاحب ایسا کرتے ہیں یا فلاں نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اب جو بھی فلاں ہے اسے اللہ کے رسول ﷺ کی بات ہی ماننا ہوگی۔ اسی میں نجات اور فلاح ہے۔

مَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ○ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ ○ (النساء: ۱۳.۱۴)

ترجمہ: "جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان باغات میں داخل ہو گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہے گا۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو شخص نافرمانی کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور اس کی حدوں سے تجاوز کرے وہ اس کو داخل کرے گا آگ میں جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔"

اوامر پر عمل اور نواہی کے ترک پر ہی بس نہیں بلکہ حدود دین سے تجاوز کرنے سے بھی روک دیا ہے۔ اور یہی بدعات ہیں۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ دین میں اچھے کام جو بعد میں شروع ہوں وہ تو بدعت نہیں کہلاتے۔ حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ بدعات کہتے ہی ان امور کو ہیں جو اچھے سمجھ کر دین میں داخل کئے جائیں اور بدعت کی تعریف کا یہ پہلو خود قرآن میں واضح و مبرہن کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۃ الحدید' آیت ۲۷:

"وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا"

ترجمہ: "اور انہوں نے رہبانیت کی بدعت صرف رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر اختیار کی تھی۔ ہم نے وہ ان پر فرض نہیں کی تھی۔ پھر وہ اس کی رعایت کا حق ادا نہ کر سکے۔"

پس معلوم ہوا کہ بدعت دین میں اس اضافی کام کو کہتے ہیں جسے رضائے الٰہی یعنی ثواب کی امید پر کیا جائے۔ مگر اس خوش نما کام کی انجام دہی کا طریقہ لوگوں کا خود ساختہ ہوتا ہے لہٰذا نتائج کے اعتبار سے وہ کام ناقص ٹھہرتا ہے' اس لئے کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے انداز و کوائف ہی مبرا عن الخطا ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی شخص کا فعل خطا سے مصئون نہیں ہے۔

امام نووی' امام بخاری اور امام مسلم کے حوالے سے اربعین میں حضرت عائشہؓ کی روایت اس طرح نقل کرتے ہیں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو رد"

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے ہمارے اس امر یعنی دین میں نئی بات پیدا کی جو اس میں نہیں' تو وہ بات مردود ہے یعنی ناقابل قبول ہے۔"

امام مسلمؒ کی ایک دوسری روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھو رد"

ترجمہ: "جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہمارا حکم نہیں تو وہ کام مردود ہے یعنی ناقابل قبول۔"

پس اب دین میں کسی قسم کے اضافے کی گنجائش نہیں۔ صرف آپ ﷺ کے طریقے کی پیروی ہی میں نجات ہے۔ مشکوۃ شریف میں امام مسلمؒ کی صحیح سے حدیث درج ہے:

"عن جابر رضی اللہ عنہ "قال قال رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ و سلم: اما بعد' فانّ خیرَ الحدیث کتابُ اللّٰہ و خیر الھدیِ ھدیُ محمدٍ و شر الامور محدثاتھا و کلّ بدعۃٍ ضلالۃ"

یہ حدیث آپ کے ایک خطبہ کا حصہ ہے جس میں اور باتوں کے علاوہ آپ نے فرمایا:

"بے شک سب سے بہتر بات خدا کی کتاب ہے۔ اور سب سے بہتر راستہ محمد (ﷺ) کا راستہ ہے اور بدترین چیزیں وہ ہیں جو دین میں نئی نکالی گئی ہوں۔ اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

صحیحین میں ایک حدیث کے مطابق حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ تین آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوئے کہ ان سے رسول اللہ ﷺ کی عبادت کا حال دریافت کریں۔ جب ان لوگوں کو آپ کی عبادت کا حال بتلایا گیا تو انہوں نے آپ ﷺ کی عبادت کو کم خیال کر کے آپس میں کہا رسول اللہ ﷺ کے سامنے ہم کیا چیز ہیں۔ خدا نے تو ان کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کر دئے (یہ سن کر ان میں سے) ایک نے کہا: میں اب ہمیشہ ساری رات نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا: اور میں دن کو ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا اور کبھی افطار نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔ پس اسی دوران رسول اللہ ﷺ وہاں تشریف لے آئے اور ان سے فرمایا: کیا تم نے ایسا ایسا کہا ہے؟ تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سے زیادہ اس کا تقویٰ اختیار کرتا ہوں۔ بایں ہمہ روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں' (رات کو) نماز بھی پڑھتا ہوں سوتا بھی ہوں۔ اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ (یہی میرا طریقہ ہے) پس جو شخص میرے طریقے سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں۔ اس حدیث مبارک سے صاف ظاہر ہے کہ صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہی پسندیدہ ہے' یہاں تک کہ

عبادات میں بر بنائے تقویٰ بھی غلو جائز نہیں' کیونکہ اس دین پر عمل کا تقاضا صرف صحت مندوں' دولت مندوں یا کسی خاص قسم کے لوگوں سے ہی نہیں ہے بلکہ بوڑھوں' جوانوں' کمزوروں' مفلسوں اور ثروت مندوں سب ہی نے اس پر عمل کرنا ہے۔ اس لئے رسول پاک ﷺ کا عمل جو امت کے افراد کے لئے بہترین نمونہ ہے متوسط اور معتدل مقدار میں ہے۔ لہٰذا عبادات بھی ایسی مقدار میں پسندیدہ ہیں جو حضور ﷺ نے اختیار کی۔

بدعات کی ترویج سے اسلام کے حسین و جمیل چہرے پر داغ پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بدعات کو رواج دینے والوں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> مجھ سے پہلے کسی قوم میں کوئی نبی خدا نے ایسا نہیں بھیجا جس کے مددگار اور دوست اسی قوم میں سے نہ ہوں۔ جو اس کے طریقہ کے پیرو ہوتے اور اس کے احکام کی پوری اطاعت کرتے پھر ان کے بعد ایسے نالائق لوگ پیدا ہوتے جن کو ناخلف کہا جاتا۔ یہ لوگ ایسی بات کہتے جس کو خود نہ کرتے اور وہ کام کرتے جن کا ان کو حکم نہیں ملا تھا۔ پس جو شخص (تم میں سے) ان لوگوں سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے' اور جو ان سے اپنی زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے' جو ان سے اپنے دل سے جہاد کرے وہ مومن ہے۔ اور اس کے بعد (یعنی جو یہ بھی نہ کر سکے اس میں) تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں۔"

گویا اہل ایمان کا فرض ہے کہ بدعات پر کڑی نظر رکھیں۔ اور مسلم معاشرے میں ان کا وجود برداشت نہ کریں' تاکہ اسلام وہی اسلام رہے جو ہمیں رسول پاک ﷺ سے ملا ہے۔ یہاں بدعات کو رواج دینے والوں کے لئے بھی لمحہ فکریہ ہے۔ اول تو بدعت کو فوراً ہی پہچان لینا چاہئے اور اگر بالفرض کوئی شخص بدعت اختیار کرتا ہے تو دوسروں کے ٹوکنے سے اسے باز آجانا چاہئے کیونکہ بدعت چھوڑنے سے اس کے اسلام میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ البتہ بدعت پر گامزن رہنے سے ایمان اور اسلام کا نقصان ضرور ہے۔

حضرت عرباض بن ساریہؓ ایک طویل حدیث بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

> "تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا پس وہ اختلاف کثیر دیکھے گا۔ ایسی حالت میں تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے اور ہدایت یافتہ خلفاء کے طریقے کو

مضبوط پکڑو اور اسی پر بھروسہ رکھو۔ اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑے رہو۔ اور بچو تم دین میں نئی باتوں کے پیدا کرنے سے' اس لئے ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔" (مشکوۃ بحوالہ احمد' ابوداؤد)

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے خلفائے راشدین بھی معتمد علیہم ہیں۔ آپ ﷺ کی تربیت نے انہیں اس مقام پر پہنچایا کہ جہاں آپ ﷺ نے اپنی امت کو سنت نبوی ﷺ کی پیروی کی تلقین کی وہاں اپنے خلفائے راشدین کے طریقے کو بھی سنت قرار دیا۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ خلافت راشدہ ٹھیک طور پر علیٰ منہاج السنہ تھی اور اس دوران کوئی بدعت نہ پیدا ہوئی۔ خلفائے راشدین پر امت کے اعتماد کے جواز کے سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی ایک روایت بھی یہاں نقل کی جاتی ہے جو ترمذی شریف میں موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"میری امت پر ایک ایسا ہی زمانہ آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا تھا.... بنی اسرائیل کی قوم بہتر فرقوں میں منقسم ہو گئی تھی' میری امت تہتر فرقوں میں بٹے گی جن میں سے ایک فرقہ کے سوا سب دوزخ میں جائیں گے۔" لوگوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ وہ فرقہ کون سا ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مَا اَنَا علیہ و اَصحَابِی" یعنی جو اس راہ پر چلے گا جس پر میں ہوں اور میرے اصحابؓ ہیں۔

ہدایت کی راہ اور نجات کا راستہ قرآن و سنت کے اندر منحصر ہے۔ بس انہی سے تمسک کا حکم دیا گیا ہے۔ یہی صراط مستقیم ہے اور یہی اختیار کرنے کے قابل ہے۔ حضرت مالک بن انسؒ بطریق مرسل بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ جب تک تم ان کو مضبوط پکڑو گے گمراہ نہ ہو گے۔ اور وہ ہیں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔"

بعض لوگوں کو جب بدعت پر ٹوکا جائے تو وہ جدید ایجادات مثلاً لاؤڈ سپیکر' ہوائی جہاز وغیرہ کے استعمال کی آڑ لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ تو سراسر تجاہل عارفانہ ہے کیونکہ یہ ایجادات دینی نہیں بلکہ دنیوی ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے تکمیل دین کی خوشخبری سنائی ہے تکمیل دنیا کی نہیں۔ دنیا تو ترقی کرتی رہے گی۔ اور بلکہ مسلمانوں کو حکم ہے کہ دنیوی ترقی کے مراحل طے کرنے میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ البتہ دین کا کوئی نقص کبھی ظاہر نہ ہو گا کہ اس کی اصلاح کے

لئے کوئی قدم اٹھانا پڑے۔

بدعت کی قباحت قرآن و حدیث میں نہایت واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے مگر بھولے بھالے مسلمان ظاہری چمک دمک اور حسن عقیدت سے متاثر ہو کر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ لیکن نتیجہ وہی کہ جس چیز کی بنیاد معصیت خدا اور رسول پر رکھی جائے وہ چیز انتہائی خلوص نیت اور طلب رضائے الٰہی کے باوجود اچھے نتائج نہیں پیدا کر سکتی۔

قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں دو عیدیں ہیں جنہیں عہدِ نبوی ﷺ اور دور خلفائے راشدین میں منایا جاتا تھا۔ ان دونوں ایام کے منانے کا مکمل طریقہ اور پورے آداب رسول پاک ﷺ کے تعلیم کردہ ہیں۔ آج اگر مسلمان کسی تیسری عید کا اضافہ کرنا چاہیں تو ان کا یہ اقدام اگرچہ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے ہی ہو مگر وہ اس کا پروگرام کہاں سے لیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ تیسری عید خیر القرون اور خلافت راشدہ میں موجود نہ تھی تو اس کا پروگرام خود ہی بنانا پڑے گا۔ جب کوئی غیر نبی اس دن کے منانے کا طریقہ ایجاد کرے گا تو غلطی کا امکان موجود ہے۔ پھر اس عید کا موجد کس حیثیت میں امتِ مرحومہ کو اس کا پابند بنائے گا۔ اور دنیا کے مسلمان کس ضابطہ کے تحت رسول پاک ﷺ کی بتائی ہوئی عیدوں میں تیسری کا اضافہ قبول کریں گے۔ اور اگر تیسری عید کا اضافہ مقبول ٹھہرا تو امت کے کسی اور فرد کی طرف سے چوتھی' پانچویں اور پھر چھٹی عید کی ایجاد کو کس طرح غلط قرار دیا جا سکے گا۔ پس معلوم ہوا کہ خیر اسی میں ہے کہ اخروی نجات کے لئے کامل اور مکمل دین پر ہی انحصار کیا جائے جو بہت کافی ہے۔ جب اس دین نے ابوبکرؓ اور عمرؓ کو کفایت کیا تو سب مسلمانوں کو بھی کفایت کرے گا۔

اگرچہ بدعت کی مذمت کو واضح کرنے کے لئے متذکرہ بالا احادیث بہت کافی ہیں تاہم بدعت کو رواج دینے والے شخص کے متعلق بھی آنحضور ﷺ فداہ امی وابی کا ایک فرمان سن لیجئے جسے صاحب مشکوۃ نے بیہقی کی شعب الایمان سے نقل کیا ہے:

عن ابراھیم ابن میسرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم: من وَقّر صاحبَ بدعۃٍ فقد اعان علیٰ ھدمِ الاسلام

ترجمہ: حضرت ابراہیم بن میسرہ سے روایت ہے کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: "جس نے کسی بدعتی شخص کی تعظیم کی اس نے دین اسلام کو ڈھا دینے میں مدد دی۔" فَاعْتَبِرُوا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ

معازف و مزامیر کا شرعی حکم (۳)

مولانا عبدالغفار حسن

چند شبہات اور ان کا ازالہ

موسیقی اور معازف و مزامیر کی حرمت پر چند شبہات بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ ذیل میں یہ شبہات مع جواب درج ہیں تاکہ اس بحث کا کوئی پہلو بھی تشنہ اور نامکمل نہ رہنے پائے۔

(۱) اگر واقعی معازف و مزامیر ایسی ہی شدید وعید کے موجب تھے تو ان کا ذکر قرآن میں کیوں نہیں آیا؟

(۲) بعض صحابہؓ و تابعینؒ اور سلف صالحینؒ سے معازف کے استعمال یا سماعِ غناء کا ثبوت ملتا ہے، اس کی کیا توجیہ کی جائے گی؟

گزشتہ اشاعتوں میں صحیح بخاری کی روایت (جس میں گانے بجانے کے آلات کی مذمت ہے) کی تشریح کرتے ہوئے ان احادیث کا مفہوم متعین کیا گیا تھا جن سے گانے بجانے کو "سنتِ نبوی" ثابت کیا جاتا ہے۔ آج کی اشاعت میں اس شبہ کا ازالہ مقصود ہے کہ اس قسم کے مسائل میں قرآن خاموش ہے، محض حدیث کی بنا پر کسی شے کی حرمت و حلت کا فتویٰ کیسے دیا جاسکتا ہے؟ اولاً تو یہ موقف ہی غلط ہے کہ جس چیز کے بارے میں قرآن بظاہر خاموش ہو اس کی حلت و حرمت کا فتویٰ سنت کی بنا پر نہیں دیا جا سکتا۔ یہ الگ مستقل موضوع ہے، اس پر تفصیلی گفتگو کسی دوسرے موقع پر ہو سکتی ہے۔ یہاں موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے صرف اتنا بتلانا مقصود ہے کہ قرآن مجید نے حلت و حرمت کے ایسے واضح اصول اور ضابطے مقرر کر دیئے ہیں کہ ان کی روشنی میں معازف و مزامیر کی حلت و حرمت کا فیصلہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

سورۂ لقمان کے شروع میں پہلے ان لوگوں کی صفات بیان کی گئی ہیں جو قرآن مجید سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنے غلط قسم کے مشاغل کی بنا پر قرآنی ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾ (لقمان:۶)

ترجمہ: "بعض آدمی ایسے بھی ہیں جو "لہوالحدیث" خریدتے ہیں تاکہ بغیر کسی دلیل کے خدا کی راہ سے بھٹکائیں اور اسے مذاق بنائیں۔ یہ لوگ ہیں جن کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔"

"لَھو" کے معنی امام راغب اصفہانی کی تحقیق کے مطابق یہ ہیں:۔

اللّھو ما یشغل الانسان عما یعنیہ و یھمّہ (مفردات راغب' ص ۴۷۱)

"لہو ہر اس شے کو کہتے ہیں جو انسان کو اس کے مقصد سے ہٹا دے۔"

امام شوکانی لکھتے ہیں:۔

لھو الحدیث کلّ ما یُلھی من الخیر من الغناء و الملاھی' و الاحادیث المکذوبۃ و کل ما ھو منکر (تفسیر فتح القدیر' ج ۴' ص ۲۶۲)

"لہوالحدیث سے مراد ہر وہ شے ہے جو نیک کاموں سے غافل کر دے۔ گانا بجانا' بے سروپا داستانیں اور ہر قسم کا منکر اس کے تحت آسکتا ہے۔"

عام تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے کہ جس قوم میں "معازف و مزامیر (گانے بجانے کے آلات) نے مقبولیت حاصل کی وہ صراط مستقیم سے ہٹ کر فواحش و منکرات کے سیلاب سے نہ بچ سکی۔ اسی بنا پر اکثر صحابہ کرام نے لہوالحدیث کی تفسیر میں غناء کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ سنتِ نبوی سے بھی اسی تفسیر کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

مشہور مفسر امام قرطبی لکھتے ہیں:۔

انّ اولی ما قیل فی ھذا الباب ھو تفسیر لھو الحدیث بالغناء قال و ھو قول الصحابۃ و التابعین (تفسیر فتح القدیر' ج ۴' ص ۲۶۲)

"لہو الحدیث کی تفسیر میں جتنے بھی اقوال پائے جاتے ہیں ان میں سب سے راجح قول اس کا ہے جس نے لہو الحدیث سے غناء مراد لیا ہے' یہ صحابہ اور تابعین کا قول ہے۔"

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ ان تمام تفسیری اقوال میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں پایا جاتا کیونکہ ان سب کا اصل مرکزی معنیٰ وہی ہے جس کی وضاحت امام راغب اور امام شوکانی کی زبانی مذکورہ بالا سطور میں کی جا چکی ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ "لھو الحدیث" کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ھو الغناء' واللّٰہِ الّذی لا الٰہ الا ھو' یرددھا ثلاثا

(ابن کثیر' ج ۳' ص ۴۴۱)

"لہو الحدیث سے مراد غناء ہے' قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی الٰہ (معبود) نہیں ہے۔ یہ کلمہ حضرت عبداللہ نے تین بار فرمایا۔"

اس تفسیر و تشریح میں حضرت ابن مسعودؓ تنہا نہیں ہیں بلکہ مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ' حضرت جابر اور اکابر تابعین' عکرمہ' سعید بن جبیر' مجاہد' مکحول' عمرو بن شعیب' حسن بصری بھی ان کے ہم نوا ہیں۔

قرآن فہمی میں تفسیر صحابہ کو جو اہمیت حاصل ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ امام حاکم لکھتے ہیں:۔

ان تفسیر الصحابی الذی شھد الوحی والتنزیل عند الشیخین حدیث مسند (اغاثۃ اللفان' ص ۱۲۹)

"ایسے صحابی کی تفسیر جس نے وحی اور نزول قرآن کا زمانہ پایا ہو امام بخاری اور امام مسلم کے نزدیک مسند حدیث کے حکم میں ہے۔"

امام ابن القیمؒ لکھتے ہیں:

"بعد والوں کی بہ نسبت صحابہ کرام کی تفسیر کو قبول کرنا زیادہ بہتر ہو گا۔ قرآن ان کے سامنے نازل ہوا۔ وہ قرآن کے پہلے مخاطب تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی قرآن کی قولی اور عملی تفسیر کا ان کی نگاہوں نے خود مشاہدہ کیا تھا' زبان کے لحاظ سے فصاحت و بلاغت میں جو ان کا نمایاں مقام تھا اس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس لئے بغیر کسی قوی دلیل کے ان کی تفسیر سے انحراف کیسے کیا جا سکتا ہے"؟(اغاثۃ اللہفان، ص ۱۲۹)

اس آیت کی وضاحت میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "لہوالحدیث" کی حرمت اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ اضلال (گمراہ کرنا) مقصود ہو۔ کیونکہ قرآن میں "لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ" فرمایا گیا ہے، اب اگر محض تفریح نفس مقصود ہو تو اس صورت میں گانے بجانے کو حرام کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے؟

واضح رہے کہ "لِيُضِلَّ" میں "لامِ علت" بھی مانا جا سکتا ہے۔ یعنی لہوالحدیث اختیار کرنے کا اصل مقصود لوگوں کو گمراہ کرنا ہو۔ نیز اس لام کو "لامِ عاقبت" بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی آخرکار نتیجہ ہی یہ نکلتا ہے کہ معازف و مزامیر کے شیدائی راہ حق سے ہٹ کر ضلالت کی وادیوں میں خود بھی گم ہو جاتے ہیں اور دوسروں کی گمراہی اور بے راہ روی کا بھی باعث بنتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو جو لطف و سرور رقص و سرود کی محفلوں میں حاصل ہوتا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی وہ قرآن اور ذکرِ الٰہی میں محسوس نہیں کرتے بلکہ قرآن کی تلاوت ایسے لوگوں کے لئے انتہائی انقباض اور وحشت کا موجب بنتی ہے۔ حقیقت میں ان کا وہی حال ہوتا ہے جس کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

﴿وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا﴾(لقمان:۷)

"جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ غرور و تکبر کرتا ہوا پلٹ جاتا ہے گویا اس نے سنا ہی نہیں جیسے اس کے دونوں کانوں میں بہرہ پن ہے۔"

سورۃ المدثر میں قرآن سے وحشت کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے:

﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ○ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ○ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ ○﴾

"ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ نصیحت سے اس طرح روگردانی کرتے ہیں کہ گویا وہ جنگلی گدھے ہیں جو کسی شیر کی صورت سے بدک کر بھاگ جاتے ہیں۔"

قرآن سے اعراض

امام ابن تیمیہؒ غناء اور سماع کے نقصان اور نفع کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
"لیکن ان کی مضرت نفع سے زیادہ ہی ہے' ٹھیک اسی طرح جس طرح شراب اور قمار میں لوگوں کے لئے بعض فائدے ہیں' مگر ان کا نقصان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے شریعت نے ان کی اجازت نہیں دی اور یہ اس لئے کہ شریعت راجح مصلحت ہی کا لحاظ کرتی ہے۔ جس چیز میں مصلحت کا امکان قوی ہوتا ہے شریعت اسے مستحسن رکھتی ہے' لیکن جس میں نقصان کا احتمال زیادہ ہوتا ہے تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی"۔

اس کی مثال یوں ہے کہ کوئی شخص پانچ درہم چوری کرے اور پھر دو درہم خیرات کر ڈالے تو خیرات کرنا اگرچہ نیک کام ہے مگر اس کی وجہ سے چوری مباح نہ ہوگی۔ یہی حال سماع اور غناء کا ہے' اس میں کبھی کوئی نفع بھی ہو سکتا ہے' مگر اس کی مضرت بہرحال نفع سے زیادہ ہی ہے۔ یہ نفس میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے' جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ جب اس کی چاٹ پڑ جاتی ہے تو آدمی کو قرآن کی تلاوت و سماع میں کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی' بلکہ کبھی قرآن سے بیزاری ہو جاتی ہے' اس کا سماع نفس کے لئے بار گراں بن جاتا ہے اور نفرت اور وحشت بڑھ جاتی ہے۔ جس طرح صادق مسلمانوں کی طبیعت پر تورات' انجیل اور اہل کتاب و صابئین کے علوم کی تحصیل گراں ہوتی ہے اسی طرح گانے بجانے کے دلدادہ کے لئے قرآن کی تلاوت و سماع میں گرانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس چیز کی یہی مضرت کیا کم ہے کہ آدمی کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے شغف باقی نہیں رہتا۔

کراہت و نفرت

چونکہ سماع سے وہ بات حاصل نہیں ہوتی جسے اللہ اور اس کا رسول ﷺ پسند کرتے ہیں بلکہ اکثر اوقات اس سے وہ بات حاصل ہوتی ہے جسے اللہ اور اس کا رسول ناپسند کرتے ہیں بلکہ اس سے نفرت رکھتے ہیں' اسی لئے سماع کا حکم نہ اللہ نے دیا نہ اس کے رسول نے' نہ سلف صالحین نے اور نہ مشائخ کرام نے۔

ممانعت کی وجہ

نفس پر آواز کا اثر اوقات و حالات کے اختلاف سے ہوا کرتا ہے' کبھی مسرت پیدا ہوتی ہے' کبھی غم کی کیفیت طاری ہوتی ہے' کبھی غصہ آجاتا ہے' کبھی کوئی اور جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ سریلی اور رسیلی آواز بھی انسان کو اس طرح مست کر دیتی ہے جس طرح شراب سے مستی پیدا ہو جاتی ہے۔ مستی کے معنی یہ ہیں کہ نفس پر لذت اس درجہ حاوی ہو جائے کہ عقل و فہم باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی لذت جس کی موجودگی میں عقل و فہم غائب ہو جائے کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی' بلکہ مضر ہوتی ہے۔ ذکر الٰہی اور نماز سے غافل کر دیتی ہے' عداوت اور پھوٹ پیدا کر دیا کرتی ہے۔ (رسالۃ الرقص والسماع' ص ۵۰)

اس موقع پر یہ حقیقت بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہنی چاہئے کہ قرآن مجید میں شراب اور جوئے کی حرمت بیان کرتے ہوئے اس کی علت اور وجہ یہ بتلائی ہے کہ ان دونوں کے ذریعہ شیطان انسانوں کے درمیان پھوٹ ڈالتا ہے' اللہ کی یاد اور نماز سے روکتا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ﴾ (المائدہ:۹۱)

"شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے درمیان دشمنی اور رنجش ڈلوا دے۔ اور تمہیں خدا کی یاد اور نماز سے روک دے۔ پس کیا تم ان کاموں سے باز رہو گے (یا نہیں؟)

کیا غناء اور سماع کے جواز کے لئے جو استدلال پیش کیا گیا ہے کیا بعینہٖ وہ شراب اور جوئے کی علت پر چسپاں نہیں ہو سکتا؟ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ شراب اور جوئے سے ہماری دلچسپی محض تفریح نفس کے لئے ہے' نہ کہ لوگوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور اللہ کی یاد سے روکنے کے لئے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ "لہو الحدیث" غناء اور گانے بجانے کے آلات سے دلچسپی رفتہ رفتہ انسان کو راہ حق سے ہٹا دیتی ہے اور آخر کار نتیجہ ضلال (گمراہ ہونے) اور اِضلال

النّاس (لوگوں کو گمراہ کرنے) کی شکل ہی میں نمودار ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ زیر بحث آیت میں "لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ" میں "لام عاقبت" ماننا بے بنیاد نہیں ہے' قرآن مجید سے اس کی مثال ملتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد ان کی والدہ نے ان کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا تھا۔ بعد میں فرعونیوں نے ان کو اٹھالیا' قرآن مجید نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

﴿فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا (القصص:۸)﴾

"پس اسے (حضرت موسیٰؑ کو) فرعونیوں نے اٹھالیا تاکہ وہ ان کے لئے دشمنی اور غم کا باعث بنے۔"

اس آیت میں "لامِ علت" کسی صورت میں مراد نہیں ہو سکتا' یہاں لام عاقبت ہی مراد ہے' یعنی موسیٰ علیہ السلام کو اٹھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ فرعونیوں کے لئے عداوت اور مصیبت کا موجب بن گئے۔

غناء اور معازف و مزامیر کی حرمت پر قرآن مجید کی دوسری آیات سے بھی اہل علم نے استدلال کیا ہے' لیکن اس موقع پر صرف اسی ایک آیت کی تشریح پر اکتفا کی جاتی ہے۔

دوسرا شبہ

بعض حامیانِ موسیقی صحابہ کرامؓ' تابعینؒ اور سلف صالحینؒ کے ناموں کی ایک طویل فہرست پیش کرتے ہیں کہ "یہ سب حضرات نہ صرف یہ کہ گانے بجانے کے حامی تھے بلکہ عملاً اس میں دلچسپی بھی لیا کرتے تھے' پھر دلچسپی بھی ایسی کہ بعض اوقات پوری رات اسی شغل میں گزار دیا کرتے تھے۔"

خیر القرون کا مسلک

لیکن اصل حقیقت وہی ہے جسے امام ابن تیمیہؒ نے پیش کیا ہے۔ تالیاں بجانا' گانا' ڈھول بجانا' بانسریاں بجانا' ایسی مجلسوں میں شریک ہونا اور اسے عبادت و دین سمجھنا اسلام سے نہیں ہے۔ نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے' نہ آپ کے خلفاء نے

اسے روا رکھا ہے' نہ مسلمانوں کے کسی امام نے اسے مستحسن قرار دیا ہے۔ دین داروں میں سے کسی نے بھی کبھی یہ فعل نہیں کیا' نہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں' نہ صحابہؓ کے زمانہ میں' نہ تابعینؒ کے زمانہ میں نہ تبع تابعینؒ کے زمانہ میں' بلکہ خیرالقرون میں کوئی مسلمان بھی اس قسم کے سماع میں کبھی شریک نہیں ہوا۔ نہ حجاز میں' نہ شام میں' نہ یمن میں' نہ عراق میں' نہ خراسان میں' نہ مغرب میں' نہ مصر میں' بلکہ یہ چیز سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ تیسرے قرن میں یہ ایجاد کی گئی' اسی لئے امام شافعی نے اس کی نسبت فرمایا: "بغداد میں میں ایسی چیز چھوڑ آیا ہوں جسے زندیقوں نے ایجاد کیا ہے۔" (رسالہ وجد وسماع' ص ۱۷)

امام مالکؒ واہل مدینہ کا طرز عمل

دوسری جگہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ۔

"اسحاق بن موسیٰ نے امام مالک سے سوال کیا کہ اہل مدینہ کس قسم کے گانے کو مباح سمجھتے تھے۔ امام مالکؒ نے جواب دیا: یہ فعل ہمارے ہاں صرف فاسق ہی کرتے ہیں"۔

یہ تصریح ان کے مذہب کی کتابوں میں مشہور و معروف ہے۔ اس کے بعد شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

"بعض لوگوں نے امام مالک کی نسبت کہا ہے کہ انہوں نے ستار اور سارنگی سے شغل کیا ہے۔ یہ ایک سخت تہمت ہے جو جاہلوں نے ایجاد کی ہے' یہ میں نے اس لئے بیان کر دیا کہ ابو عبدالرحمٰن سلمی اور محمد بن طاہر مقدسی نے اس باب میں بکثرت حکایات و آثار نقل کئے ہیں' جو لوگ علم صحیح اور احوال سلف سے واقف نہیں ہیں وہ ان کی تحریروں سے دھوکے میں پڑ سکتے ہیں۔"

سچی جھوٹی روایات

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے واضح طور پر لکھا ہے کہ:

"شیخ ابو عبدالرحمٰن سلمی میں نیکی' زہد' دین اور تصوف تھا مگر وہ اپنی کتابوں میں

اپنے مقصود کے مطابق تمام غث و سمین اور رطب و یابس روایات جمع کر گئے ہیں' چنانچہ ان کی کتابوں میں ایسی باتیں بھی موجود ہیں جو دین میں نفع پہنچا سکتی ہیں اور ایسی باتیں بھی ہیں جو ناواقفوں کے لئے نقصان رساں بھی ہیں' بعض اہل علم نے ان کی روایت قبول کرنے میں تامل کیا ہے۔ حتیٰ کہ امام بیہقیؒ جب ان سے روایت کرتے تھے تو تصریح کر دیا کرتے تھے کہ یہ ابو عبدالرحمٰن نے ہمیں اپنی اصل کتاب سے سنایا ہے۔ محمد بن طاہر مقدسی اچھے محدث تھے' حدیث اور رجال حدیث سے پوری واقفیت رکھتے تھے مگر اکثر متاخر محدثین اور اہل زہد کی طرح وہ بھی ہر غث و سمین کو جمع کر دیا کرتے تھے۔" (رسالہ وجد و سماع' ص ۶۱)

واضح رہے کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بعض شائع کردہ رسائل میں زیادہ تر انہی دونوں حضرات کی روایات پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اتحاف السادۃ المتقین شرح احیاء علوم الدین کے مصنف مرتضیٰ زبیدی کا سارا بھی یہی روایات و آثار ہیں۔

عبداللہ بن جعفرؓ کی طرف بھی یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ وہ گانے بجانے سے دلچسپی لیا کرتے تھے' اگر اس روایت کو کسی درجے میں درست مان لیا جائے تو اس کا جواب وہی ہے جو امام ابن تیمیہؒ نے دیا ہے:

"یہ کہنا اور بھی مضحکہ انگیز ہے کہ فلاں فلاں ولی اللہ نے ایسا کیا ہے' اور اگر یہ صحیح ہو تو دوسرے بکثرت اولیاء نے اس کی مذمت کی ہے۔ ایک ولی اللہ' دوسرے ولی اللہ پر اعتراض کر سکتا ہے۔ اولیاء اللہ میں باہمی جنگ بھی ہو چکی ہے۔ جنگ صفین میں جب طرفین کی فوجیں بڑھیں تو لوگوں نے کہا کہ جنتی جنتیوں سے لڑنے چلے ہیں ... اگر ولی اللہ کسی مکروہ یا ممنوع فعل کا مرتکب ہو تو اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ایسے ہفوات اور لغزشوں سے ولی اللہ اپنی ولایت سے محروم نہیں ہو جاتا ہے پھر یہ بھی ہرگز ثابت نہیں کہ اولیاء سلف میں سے کسی نے بھی ایسے بدعتی سماع میں شرکت کی ہو جو دلوں کو شدید فتنوں میں مبتلا کر دے۔" (رسالہ وجد و سماع' ص ۶۰)

امام ابن تیمیہؒ کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ جمل اور صفین میں صحابہؓ کی شرکت یہ معنی نہیں رکھتی کہ قتال بین المسلمین جائز ہے۔

اسی طرح بالفرض صحابہؓ میں سے اگر کسی صاحب نے غناء سے دلچسپی لی بھی ہے تو اس کا معنی یہ نہیں ہیں کہ قرآنی اصول' قابل اعتماد احادیث اور جمہور صحابہ اور سلف صالحین کے مسلک کو نظر انداز کر کے عبداللہ بن جعفرؓ کے مسلک کو "اسوۂ حسنہ" قرار دے دیا جائے' بشرطیکہ ان کی طرف غناء کی نسبت صحیح طور پر ثابت بھی ہو۔

سلف صالحین کا مسلک

ابو بکر طرطوشی لکھتے ہیں کہ ابراہیم بن سعد اور عبید بن حسن العنبری قاضیؒ بصرہ یہ دونوں غناء کے قائل تھے' لیکن ان کا یہ مسلک جماعت مسلمین کے یکسر خلاف تھا' امت میں کوئی بھی اس بارے میں ان کا ہم نوا نہیں ملتا۔ (اغاثۃ اللفان' ص ۱۲۲)

علامہ آلوسیؒ کہتے ہیں کہ عز بن عبدالسلام اور ابن دقیق العیدؒ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ سماع کے قائل تھے بے بنیاد اور سرتاسر جھوٹ ہے۔ (تفسیر روح المعانی' ج ۲۱' ص ۶۸)

ائمہ اربعہ کا مسلک

علامہ آلوسیؒ امام طرطوشی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ غناء کی حرمت کے قائل تھے' اہل کوفہ اور اہل بصرہ کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے' سفیان' حماد' شعبی' ابراہیم نخعی سب کا یہی مسلک تھا۔ امام مالک بھی اس کی حرمت کے قائل تھے۔ ان کا ایک فتویٰ ہے کہ اگر لونڈی خریدے اور بعد میں وہ مغنیہ ظاہر ہو تو مشتری اسے عیب دار قرار دے کر واپس کر سکتا ہے۔ امام مالک سے اہل مدینہ کے طرز عمل کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: "انما یفعلہٗ عندنا الفُسّاق" یعنی ہمارے ہاں یہ کام فاسق فاجر لوگ کرتے ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ بھی اس حرمت کے قائل تھے۔ امام محترم کے صاحبزادے عبداللہ نے غناء کے بارے میں اپنے والد سے پوچھا' تو انہوں نے جواب دیا کہ غناء دل میں نفاق کا بیج بوتا ہے۔ امام شافعی اسے مکروہ مشابہ باطل قرار دیتے ہیں۔ ان کا فتویٰ ہے کہ جو اس

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

غم اور خوف سے نجات

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک تجزیاتی مطالعہ

ـــــ ڈاکٹر احمد افضال ـــــ

(آخری قسط)

ساتواں سبق

قرآن حکیم کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کام اللہ کے اذن کے بغیر نہیں ہو سکتا' اور بعض آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنے ارادے اور عمل میں آزاد ہے۔ سطحی طور پر یہاں تضاد نظر آتا ہے جس کی وجہ سے متکلمین میں جبر و قدر کی طویل بحثوں نے جنم لیا۔ اس مسئلے کا تعلق اللہ تعالیٰ کے تکوینی رازوں سے ہے لہٰذا اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا کسی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ البتہ عملی نقطۂ نظر سے بعض باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

دنیا میں انسان پر وارد ہونے والے حالات کے پیچھے دو قسم کے اسباب کار فرما ہوتے ہیں' ایک تو عام مادی اسباب جن سے سب واقف ہیں اور دوسرے اللہ تعالیٰ کی مشیت جو پوشیدہ رہتی ہے۔ پھر انسان سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں ان کی پشت پر بھی دو قسم کے اسباب کام کرتے ہیں' ایک انسان کا اپنا ارادہ اور جد و جہد' اور دوسرے اللہ تعالیٰ کی مشیت۔

خدا نے کائنات کا نظام ایسا بنایا ہے کہ ظاہری طور پر اسباب اور نتائج آپس میں جڑے ہوئے ہیں اور ہر CAUSE سے کوئی نہ کوئی EFFECT برآمد ہوتا ہے۔ لیکن باطنی طور پر تمام اسباب سے نتیجے نکالنے والی ہستی اللہ کی ہے جو فاعل حقیقی اور مسبب الاسباب ہے۔ حیات دنیا کا ظاہری پہلو تو یہ ہے کہ حالات کی ہر تبدیلی کچھ وجوہات و اسباب سے ہوتی ہے

اور انسان کوئی مقصد حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ مناسب سعی و عمل نہ کرے۔ لیکن حیات دنیا کا باطنی پہلو یہ ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر نہ کوئی مصیبت آ سکتی ہے نہ نعمت مل سکتی ہے اور نہ اللہ کی مشیت کے بغیر ہمیں کوئی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان ظاہری اور باطنی پہلوؤں' یا دوسرے الفاظ میں "تدبیر" اور "توکل" کے درمیان توازن برقرار رکھیں۔ تدبیر کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی مصیبت کو دور کرنے کے لئے تمام ممکن ذرائع و وسائل کو استعمال کرے' اور توکل کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اصل بھروسہ اپنی قوت' ذہانت' صلاحیت' یا اسباب پر نہ ہو بلکہ صرف اللہ کی ذات پر ہو۔ تدبیر کا تقاضا یہ ہے کہ انسان رزق کی تلاش یا مقصد کے حصول میں پوری پوری سعی و جہد کرے' اور توکل کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ پائے اسے اللہ کا عطیہ سمجھے' اپنی کوشش کا نتیجہ نہ جانے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم اپنی اونٹنی کو باندھو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ (ترمذی)--- یہی بات ایک روسی کہاوت میں بیان کی گئی ہے کہ ساحل پر پہنچنے کے لئے خدا سے دعا کرتے رہو اور چپو چلانے سے ہاتھ مت روکو۔

لیکن بہت سے لوگ تدبیر اور توکل کے درمیان توازن سے محروم ہیں۔ جس کی نظر حیات دنیا کے ظاہری پہلو پر جم جاتی ہے وہ اپنی کوشش اور منصوبہ بندی کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے۔ اور جس کے دل میں حیات دنیا کے باطنی پہلو کا غلبہ ہو جاتا ہے وہ عمل سے بے نیاز ہو کر صرف توکل پر زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں معاملے کے صرف ایک پہلو کو اہمیت دینے کا نتیجہ ہیں۔ صرف اپنے زور بازو پر بھروسہ کرنے والا شخص یہ فراموش کر دیتا ہے کہ اللہ کے اذن کے بغیر ایک پتہ بھی جنبش نہیں کر سکتا۔ اور جو شخص اللہ کے بھروسے پر کوشش کو ترک کر دیتا ہے وہ دراصل اپنے رب کو آزمانے کی گستاخی کرتا ہے۔

ان دونوں میں سے پہلی قسم کے مغالطے نے زیادہ لوگوں کو متاثر کر رکھا ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں جابجا اللہ پر توکل اور اعتماد کرنے کی تلقین موجود ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کی یہ دعا نقل ہوئی ہے:

"اے ہمارے رب! تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے

رجوع کرلیا اور تیرے ہی حضور میں ہمیں پلٹنا ہے"۔ (الممتحنہ: ۴)

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے فرمایا تھا:

"میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا۔ حکم اس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور جس کسی کو بھی بھروسہ کرنا ہو اسی پر کرے"۔ (یوسف: ۶۷)

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جملہ نقل ہوا ہے:

"موسیٰ" نے اپنی قوم سے کہا کہ لوگو' اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر بھروسہ کرو اگر مسلمان ہو"۔ (یونس: ۸۴)

اور حضور نبی کریم ﷺ کو بھی یہی ہدایت کی گئی کہ آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں:

"اے نبی ان سے کہئے کہ میرے لئے اللہ کافی ہے' کوئی معبود نہیں مگر وہ' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ رب ہے عرش عظیم کا"۔ (التوبہ: ۱۲۹)

اچھی اور بری تقدیر: نادان لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تقدیر کے عقیدے نے مسلمانوں کو بے عمل بنا دیا ہے۔ لیکن اصل میں قصور ہماری اپنی سوچ کا ہے' ورنہ ایمان بالقدر تو وہ چیز ہے جو انسان کو انتہا درجے کی بہادری عطا کر دیتی ہے۔ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ ساری دنیا مل کر بھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی سوائے اس کے جو اللہ نے مقدر کر دیا ہے' تو بڑے سے بڑا خطرہ اور خوف بھی اسے اللہ کی راہ سے نہیں ہٹا سکتا۔ اگر کسی کو یقین ہو کہ ساری دنیا مل کر بھی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی سوائے اس کے جو اللہ نے مقدر کر دیا ہے تو اسے بڑی سے بڑی لالچ بھی حق سے متزلزل نہیں کر سکتی۔ تقدیر پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی طاقت کو اپنے نفع و نقصان کا مالک یا فاعل و مؤثر نہ سمجھے' بے سروسامانی میں ہمت نہ ہارے اور نہ سروسامان پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرے' ناکامیوں پر مایوس نہ ہو اور نہ کامیابیوں پر غرور کرے۔ بلکہ تمام تر امید اور خوف صرف اللہ سے رکھے' اسی پر بھروسہ کرے' اپنے معاملات اسی کے حوالے کر دے اور اس کی رضا پر راضی رہنا سیکھ لے۔ تقدیر کا عقیدہ انسان کو بے عمل نہیں بلکہ اتنا دلیر بنا دیتا ہے کہ اسباب و وسائل کی کمی بھی اس کو جدوجہد ترک کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ ع

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی! یہی وجہ ہے کہ قرآن ہمیں جو تعلیم دیتا ہے' ایمان بالقدر اس کا اہم حصہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

"کہو کہ ہمیں کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے اور اہل ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے"۔ (التوبہ: ۵۱)

"کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے کتاب میں لکھ نہ رکھا ہو۔ ایسا کرنا اللہ کے لئے بہت آسان ہے (یہ اس لئے بتادیا ہے) تاکہ جو نقصان بھی تمہیں ہو اس پر دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ"۔ (الحدید: ۲۳)

اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب نہیں آسکتی' اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو۔ پس جو مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے"۔ (آل عمران: ۱۶۰)

جو شخص یہ مانتا ہے کہ کائنات میں اصل حکم اللہ ہی کا چل رہا ہے' تو اسے عزم و ہمت کے ساتھ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت حاصل ہو جاتی ہے۔ شدید ترین مصائب اور خطرات میں بھی اللہ کے فضل کی امید اس کو حوصلہ ہارنے سے بچاتی ہے' اور بڑے سے بڑے نقصان کے بعد بھی تسلیم و رضا کا جذبہ اسے مایوس نہیں ہونے دیتا۔

"کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن ہی سے آتی ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے"۔ (التغابن: ۱۱)

جو لوگ ایمان حقیقی سے محروم ہیں انہیں کوئی نقصان یا خسارہ پہنچ جائے تو عرصہ دراز تک کفِ افسوس ملتے رہتے ہیں اور اس ادھیڑبن میں مبتلا رہتے ہیں کہ اگر ہم یوں کرتے تو یہ نہ ہوتا یا اگر ہم فلاں تدبیر اختیار کرتے تو حالات کچھ اور ہوتے۔

"(کفار) کہتے ہیں کہ اگر ہمارے عزیز و اقارب ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور اور نہ قتل ہوتے"۔ (آل عمران: ۱۵۶)

"(منافقین) کہتے ہیں کہ اگر اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے"۔ (آل عمران: ۱۵۴)

قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ ایسی باتیں کرنا محض جہالت ہے۔ اس کے برعکس یقین رکھنا چاہئے کہ جو کچھ اللہ چاہتا تھا وہی ہونا تھا اور وہی ہوا۔ اور جو نہیں ہوا وہ ممکن ہی نہ تھا کیونکہ مشیت الٰہی کے خلاف تھا۔

"اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت واندوہ کا سبب بنا دیتا ہے۔"
(آل عمران:۱۵۶)

"ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔" (آل عمران:۱۵۴)

اسی طرح آنے والی آفتوں کے متعلق پریشان ہو کر جان ہلکان کر لینا بھی ایمان کے منافی ہے۔ اس لئے کہ کوئی نقصان اللہ کے حکم کے بغیر پہنچ ہی نہیں سکتا اور اگر اللہ ہی کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کوئی اسے روکنے والا نہیں۔

"ان سے کہو! کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہو اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے؟ اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر وہ تم پر مہربانی کرنا چاہے؟"
(الاحزاب:۱۷)

اس سلسلے میں سب سے زیادہ روشنی دکھانے والی بات وہ ہے جو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمائی۔ یعنی:

"ہر وہ چیز جو تمہیں نفع دے اس کی پوری خواہش کرو اور اللہ سے مدد مانگو اور خود اس راہ میں کوئی کمزوری نہ دکھاؤ۔ اور اگر تمہیں اس میں کچھ تکلیف پہنچ جائے تو یہ نہ کہو کہ اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا' بلکہ یہ کہو کہ اللہ نے مقدر کر دیا تھا اور جو چاہا اس نے کیا۔ کیونکہ یہ 'اگر' شیطان کے عمل کا دروازہ کھولتا ہے۔" (صحیح مسلم)

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ خواہ ہمیں اپنی کوشش کا پھل ملے یا اپنی غلطی کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑے' دونوں طرح کے نتائج نکلنے میں ہماری کوشش یا غلطی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی شامل ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں کم از کم دو مقامات پر خیر کی نسبت اللہ کی طرف اور شر کی نسبت بندوں کی طرف کی گئی ہے۔ تاہم دونوں مقامات پر یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے خیر و شر دونوں ہی اللہ کی طرف سے ہیں۔

"اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب (غزوۂ احد میں) تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (فریق مخالف پر) پڑ چکی ہے۔ اے نبی! ان سے کہو' یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو نقصان تمہیں لڑائی کے دن پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لئے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون۔"
(آل عمران: ۱۶۵۔۱۶۷)

"اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے' اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ تمہاری (یعنی رسول ﷺ کی) بدولت ہے۔ کہو سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ تمہیں جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے' اور جو مصیبت آتی ہے وہ تمہارے اپنے نفس کی طرف سے ہے۔"
(النساء: ۷۸' ۷۹)

اس نکتے کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر کا منبع ہے اور کائنات میں جس نوعیت کا بھی شر پایا جاتا ہے وہ دراصل انسان (یا جنات) کی طرف سے اپنے اختیار کے غلط استعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے خیر کی نسبت اللہ کی طرف اور شر کی نسبت انسان کی طرف کی جاتی ہے۔ لیکن ایک دوسرے زاویے سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں اختیار اللہ ہی کا دیا ہوا ہے اور انسان جب اپنے اختیار کا غلط استعمال کر کے برائیوں کو ظہور میں لاتا ہے تو یہ اللہ کے اذن اور مشیت کے ساتھ ہی تو ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے خیر و شر دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ لہٰذا اوپر کی آیات میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں رہتا۔

آٹھواں سبق

ایک مسلمان کو دنیا میں جو تکلیفیں اور مشکلیں پیش آتی ہیں' ان کے صلے میں اللہ تعالیٰ اس کی خطاؤں سے درگزر کرتا چلا جاتا ہے اور اس طرح دنیا کی تکلیف آخرت کا نفع بن جاتی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

"مسلمان کو جو رنج اور دکھ اور فکر اور غم اور تکلیف اور پریشانی بھی پیش آتی ہے'

حتیٰ کہ ایک کانٹا بھی اگر اس کو چبھتا ہے تو اللہ اس کو اس کی کسی نہ کسی خطا کا کفارہ بنا دیتا ہے"۔ (بخاری و مسلم)

ہم میں سے کون ہے جو معصوم ہونے کا دعویٰ کر سکے؟ ظاہر ہے کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر کے محتاج ہیں' لہٰذا اس حدیث میں جو بشارت موجود ہے وہ دکھے ہوئے دلوں میں سکون و قرار پیدا کر سکتی ہے۔

نواں سبق

سکون قلب کے حصول کا ایک اور ذریعہ "دعا" ہے۔ ہم اپنے صوبے کے گورنر کے پاس اپنی درخواست اتنی آسانی سے نہیں پیش کر سکتے جس قدر سہولت کے ساتھ اس کائنات کے خالق اور پروردگار کے حضور التجائیں کر سکتے ہیں۔ ہم ہر وقت اور ہر جگہ' بغیر کسی پنڈت یا پادری کے' اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ سکتے ہیں۔

"تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو' میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا"۔ (المومن:۶۰)

"میں ان سے قریب ہی ہوں' پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں"۔ (البقرہ:۱۸۶)

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ "قضا کو کوئی چیز نہیں ٹال سکتی مگر دعا" (ترمذی) اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ تو اپنے رب کے فیصلوں کو ٹالنے کی طاقت نہیں رکھتا' لیکن اللہ تعالیٰ چاہے تو کسی بندے کی التجا سن کر اپنا فیصلہ بدل سکتا ہے۔

اس معاملے میں ہم اکثر جلد بازی کرتے ہیں اور شکوے کرنے لگتے ہیں کہ دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہماری خواہش فوراً پوری نہ کرے تو اس تاخیر میں ہماری کوئی بھلائی اور اللہ کی کوئی مصلحت چھپی ہوتی ہے۔

ہم اپنے محدود علم کی وجہ سے ایسی شے بھی مانگ بیٹھتے ہیں جو خود ہمارے لئے بری ہوتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

"ممکن ہے کہ کوئی بات تمہیں بری لگے اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو۔ اور ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے لئے برا ہو۔ اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے"۔ (البقرہ:۲۱۶)

ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ ہماری آرزو کسی دوسری شکل میں پوری فرما دیتا ہے' اور ہماری مانگی ہوئی شے سے بہتر شے عطا کر دیتا ہے' یا اس کے بدلے میں کوئی مصیبت جو آنے والی تھی اسے ٹال دیتا ہے۔

پھر ہم کبھی اللہ تعالیٰ سے ایسی دعا بھی کر دیتے ہیں جس کا پورا کرنا اس کے حکیمانہ منصوبوں کے خلاف ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ دنیا میں تو اس خواہش کو پورا نہیں کرتا' لیکن ہماری دعا کو آخرت میں ہمارے لئے اجر و ثواب کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ دعا وہ شے نہیں جو ضائع ہو جائے۔ چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"ایک مسلمان جب بھی کوئی دعا مانگتا ہے' بشرطیکہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ ہو' تو اللہ تعالیٰ اسے تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں قبول فرماتا ہے۔ یا تو اس کی وہ دعا اسی دنیا میں قبول کر لی جاتی ہے' یا اسے آخرت میں اجر دینے کے لئے محفوظ کر لیا جاتا ہے یا اسی درجے کی کسی آفت کو اس پر آنے سے روک دیا جاتا ہے۔" (مسند احمدؒ)

دراصل جب ایک شخص اپنے مقصد کے لئے تدبیر اور کوشش کے ساتھ ساتھ اللہ سے دعا بھی کرتا ہے' تو گویا وہ شعوری طور پر اعتراف کرتا ہے کہ اگر اللہ نے چاہا تو یہ کام ہو گا ورنہ نہیں۔ اس طرز فکر کا فائدہ یہ ہے کہ اگر اسے ناکامی ہو جاتی ہے تو وہ اسے مشیتِ الٰہی جانے گا اور کسی غم و اندوہ' احساس محرومی' یا ناکامی کی اذیت کا شکار نہ ہو گا۔ یہ وہ روش ہے جسے "رضا بہ قضاء" کہتے ہیں۔ یا اگر اسے کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو اسے وہ اللہ کی مہربانی اور عنایت سمجھے گا اور کسی غرور میں مبتلا نہ ہو گا۔ اور یہ شکر گزاری کا طریقہ ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"آدمی کی خوش نصیبی یہ ہے کہ جو کچھ اللہ اس کے لئے فیصلہ کرے اس سے راضی ہو' اور آدمی کی بدبختی یہ ہے کہ اللہ سے خیر اور بھلائی کی دعا نہ کرے' اور آدمی کی بدنصیبی یہ ہے کہ اللہ کے فیصلے پر ناراض ہو"۔ (ترمذی)

دسواں سبق

قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ انسان دنیا میں مزے کرنے نہیں آیا ہے بلکہ اس کی پوری

زندگی خطرات' شدائد' اور مشقتوں سے عبارت ہے۔

"ہم نے انسان کو محنت و مشقت ہی میں پیدا کیا ہے"۔ (البلد:۴)

انسان کی پوشیدہ خوبیوں کا اظہار اور اس کے علمی و فکری ارتقاء کے لئے ضروری تھا کہ اسے سازگار اور پر سکون ماحول کے بجائے ایک ایسی دنیا میں رہنا پڑے جہاں تکلیف اور دکھ اور سختی اور مشقت سے واسطہ ہو۔

——————قرآن حکیم کے مطابق یہ مرتبہ صرف اہل جنت کو حاصل ہو گا کہ ان کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ افراد کو اس سے ملتی جلتی کیفیت دنیا میں بھی نصیب ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بعض پسندیدہ بندے وہ ہیں جن کا اعتماد اور بھروسہ مخلوق پر نہیں بلکہ کلیۃً پروردگار پر ہو جاتا ہے۔ ان کا اللہ سے تعلق اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ نہ اس کے سوا وہ کسی سے ڈرتے ہیں اور نہ امید رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں دنیا ہی میں جنت کا مزا آنے لگتا ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کا قول ہے کہ "میرے دشمن میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ میری جنت اور میرا باغ میرے سینے میں ہے' جہاں جاؤں گا وہ میرے ساتھ ہے[1]"۔ ارشاد الٰہی ہے:

"جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے' ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور خوشخبری سنو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا"۔ (حٰمٓ السجدہ:۳۰)

جو لوگ مذہب کو چھوڑ کر دہریت یا ATHEISM کے قائل ہو جاتے ہیں ان میں بالعموم تکلیف دہ حد تک ذہنی کوفت اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے تصور سے دستبردار ہو جانے کے بعد نفسیاتی طور پر وہ خود کو تنہا اور بے سہارا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہ گویا ایک غیر فطری عقیدے کی نقد سزا ہے جو دنیا ہی میں مل جاتی ہے۔ اس کے برعکس طب کے پیشے سے متعلق افراد میں عام طور پر یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ زیادہ سکون اور قوت برداشت کا مظاہرہ وہی مریض کرتے ہیں جو زیادہ مذہبی ہوں۔ قطع نظر اس سے کہ

۱۔ تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۲ صفحہ ۱۹۳

مریض کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے' اہم چیز یہ ہے کہ اگر وہ ایسی ہستی پر یقین رکھتا ہو جسے ہر شے کا علم ہے' ہر چیز پر قدرت ہے' اور جو انتہائی شفیق و مہربان ہے' تو ایسا مریض بہت کم حوصلہ ہارتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین نفسیات اکثر اضمحلال اور ذہنی تناؤ کے مریضوں کے لئے دعا اور عبادت کا نسخہ تجویز کرتے ہیں۔ کسی مغربی مصنف کا جملہ ہے:

"IF YOU CAN'T STAND LIFE'S PROBLEMS,
TRY KNEELING".

اسی حقیقت کی شہادت دنیا کے عظیم ترین ماہرین نفسیات میں سے ایک (DR.CARL GUSTAV JUNG) نے بھی دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرے پینتیس برس سے زائد عمر کے مریضوں میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس کے مسئلے کا آخری حل زندگی کے مذہبی نقطۂ نظر میں نہ ملتا ہو۔[۲]

ہمارے لئے اللہ کے ذکر کا بڑا ذریعہ اس کی کتاب ہے۔ قرآن حکیم کی تلاوت اور اس پر غور و فکر کرنے سے انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت' قدرت' اور رحمت کا ایسا نقش قائم ہو جاتا ہے' جس سے مایوسی اور فکرمندی ختم اور اطمینان و سکون حاصل ہو سکتا ہے۔

"خبردار رہو اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔" (الرعد:۲۸)

حرفِ آخر

تاریخ گواہ ہے کہ اگرچہ انسان نے اپنی تدبیر اور کوشش کی بدولت بہت سی مصیبتوں اور آفتوں پر قابو پالیا ہے' تاہم تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ نئے مسائل اور نئی الجھنیں بھی جنم لیتی رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک دنیا کا موجودہ نظام قائم ہے' ہم مصائب و شدائد کو وارد ہونے سے کلیۃً نہیں روک سکتے۔ ایسی حالت میں خوف و حزن سے نجات کا

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

۲۔ "MODERN MAN IN SEARCH OF A SOUL"

سورۃ البقرۃ

آیات ۴۹-۵۰

(گزشتہ سے پیوستہ)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیرِ مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغہ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغہ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳، اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے مثلاً ۲: ۵: ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲: ۵: ۳۰ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲: ۳۲: ۲ الاعراب

زیرِ مطالعہ دو آیات یوں تو (چھوٹے چھوٹے) سات جملہ فعلیہ اور دو جملہ اسمیہ پر مشتمل ہے مگر ان میں سے بعض جملے بذریعہ حرف عطف (فا یا واو) باہم مربوط ہیں اور بعض جملے "حال" ہونے کی وجہ سے دوسرے جملے کا جزء بن جاتے ہیں۔ اس طرح ہم اس قطعہ کو ترکیب نحوی کے لیے پانچ حصوں (جملوں) میں تقسیم کر سکتے ہیں تفصیل یوں ہے۔

① واذ نجینٰکم من اٰل فرعون:

[و] عاطفہ بھی ہو سکتی ہے کہ گزشتہ مضمون کے ساتھ بھی تعلق ہے اور "مستانفہ" بھی ہو سکتی ہے کہ بظاہر یہاں سے ایک الگ بات شروع ہوتی ہے [اذ] ظرف منصوب ہے اور اس کا عامل سابقہ آیت کا "اذکروا نعمتی" بھی ہو سکتا ہے اور جملہ کو مستانفہ سمجھیں تو بھی یہاں ایک "اذکروا"

محذوف سمجھا جاتا ہے [نجّینٰکم] میں "نجّینا" فعل ماضی معروف صیغہ متکلم ہے جس میں ضمیر تعظیم "نحن" مستتر ہے اور "کُمْ" ضمیر منصوب متصل مفعول بہ ہے (تم کو)۔ چونکہ ظروف عموماً مضاف ہو کر ہی آتے ہیں اس لیے نحوی حضرات یہاں "نجّیناکم" کو "اِذْ" (ظرف) کا مضاف الیہ سمجھ کر محلاً مجرور قرار دیتے ہیں۔ تاہم آیت کا مفہوم اس "فنی باریکی" کے اظہار کے بغیر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اور "نجّیناکم" کے "محلی اعراب" کا بیان ایک بے فائدہ تکلف کے سوا کچھ نہیں۔

[مِن آلِ فرعونَ] میں "مِن" حرف الجر ہے۔ "آل" مجرور بالجر اور آگے مضاف بھی ہے اس لیے خفیف ہے (تنوین اور لام تعریف سے خالی ہے) اور "فرعون" مضاف الیہ (لہذا) مجرور ہے مگر غیر منصرف (بوجہ عجمیت اور علمیت) ہونے کی وجہ سے اس کی علامت جر آخری "ن" کی فتحہ (ـَ) ہے۔ یہ سارا مرکب جاری (من آل فرعون) متعلق فعل "نجّینا" ہے۔ اس طرح یہاں تک ایک جملہ فعلیہ مکمل ہوتا ہے۔ یعنی اس کے بعد آگے کوئی عبارت (مزید وضاحت کے لیے) نہ بھی آئے تو بھی یہ جملہ ایک مکمل مفہوم رکھتا ہے۔

④ یسومونکم سوء العذاب یذبحون ابناءکم ویستحیون نساءکم۔

[یسومونکم] میں "یسومون" فعل مضارع معروف صیغہ جمع مذکر غائب ہے اور "کُمْ" ضمیر منصوب متصل اس کا مفعول بہ ہے۔ یہاں (یسومونکم) سے شروع ہونے والا جملہ فعلیہ (جس کے باقی اجزاء آگے آرہے ہیں) "آل فرعون" کا حال ہے یعنی (تم کو نجات دی آل فرعون سے) اس حالت میں / اور حالت یہ تھی کہ "وہ تم کو چکھاتے (دیتے) تھے"۔ گویا یہاں "یسومونکم" دراصل "سائمین لکم" یا "وھم سائمون لکم" کے معنی میں ہے۔ یعنی حال ہو کر محل نصب میں ہے۔

[سُوْءَ العذاب] مضاف (سُوء) اور مضاف الیہ (العذاب) مل کر فعل (یسومون) کا مفعول بہ ثانی ہے (مفعولِ اوّل "کُمْ" تھا) کیونکہ بعض دفعہ فعل سام یسوم دو معنوں کے ساتھ بھی آتا ہے۔ اسی لیے "سوء" منصوب آیا ہے۔ علامتِ نصب "ءُ" کی فتحہ (ـَ) ہے کیونکہ یہ اضافت کی وجہ سے خفیف بھی ہے۔ اس عبارت کا ترجمہ وغیرہ [۲ : ۳۲ : ۱ (۳) اور (۴)] میں گزر چکا ہے۔

[یذبّحون] فعل مضارع معروف صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ جس میں ضمیرِ فاعلین "ھُمْ" مستتر ہے۔

[ابناءکم] مضاف (ابناء) اور مضاف الیہ (کُمْ) مل کر فعل "یذبّحون" کا مفعول بہ ہے۔ اسی لیے "ابناءَ" منصوب ہے۔ علامتِ نصب "ءَ" کی فتحہ (ـَ) ہے کیونکہ بوجہ اضافت یہ خفیف بھی ہے [وَیستحیُونَ] میں "وَ" عاطفہ ہے جس کے ذریعے ما بعد آنے والے جملے (یستحیون نساءکم)

کو سابقہ جملے (یذ بحون ابناءکم) پر عطف کیا گیا ہے [نساءکم] بھی مضاف (نساء) اور مضاف الیہ (کم) مل کر فعل "یستحیون" کا مفعول ہے اس لیے "نساءَ" منصوب ہے۔ علامتِ نصب "ءَ" کی فتحہ (ـَ) ہے۔

● یہاں یہ آخری دو فعلیہ جملے (یذبحون ابناءکم ۔اور۔ یستحیون نساءکم) بذریعہ واو عاطفہ ایک طرح سے ایک ہی جملہ بنتے ہیں اور یہ اپنے سے پہلے (حال بننے والے) جملے "یسومونکم سوءَ العذاب" کا بدل ہے (اس لیے ان کے درمیان کوئی عطف نہیں ہے) گویا یہ جملے (یذبحون ... نساءکم) اسی "یسومونکم ..." کا بیان اور اس کی وضاحت ہے کہ وہ "سوءِ العذاب" کیا تھا۔ اس صورت میں اس کا نحوی مربوط ترجمہ یوں ہوگا: "(نجات دی تم کو آلِ فرعون سے) اس حالت یہ بھی کہ وہ (تم کو سخت عذاب دیتے تھے) یعنی (تمہارے بیٹے ذبح کرتے اور بیٹیاں زندہ چھوڑ دیتے تھے) اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ آخری دو جملے (یذبحون .... نساءکم) فعل "یسومون" کی ضمیر فاعلین (هم) کا حال ہیں۔ "یسومون ..." خود "آل فرعون" کا حال تھا۔ اس طرح اس پوری عبارت (یسومونکم سے نساءکم تک) کا ترجمہ یوں ہوگا: کہ "(نجات دی تم کو آلِ فرعون سے) اس حالت میں کہ وہ تم کو سخت عذاب دیتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو ذبح کر کے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ کر۔ (یعنی ذبح کرتے ہوئے اور زندہ چھوڑتے ہوئے)

● چونکہ اردو محاورے میں "حال" کے ساتھ ترجمہ مشکل ہے اس لیے بعض مترجمین نے "یسومونکم..." کے ترجمے سے پہلے "جو" جو کہ" لگایا ہے۔ حالانکہ یہاں کوئی اسم موصول نہیں ہے اور نہ ہی "آلِ فرعون" نکرہ موصوفہ ہے۔ بس یہ اردو محاورے کی مجبوری ہے۔ بعض حضرات نے "یسومونکم ...." کا سیدھا ترجمہ ہی کر دیا ہے نہ حال کا تاثر دیا ہے نہ صفت کا نہ بدل کا۔ ان تمام جملوں کے الگ الگ تراجم (لغوی بحث کے ساتھ) حصہ "اللغۃ" میں بیان ہو چکے ہیں۔ [۲:۳۲:۱(۳)] سے [۲:۳۲:۱(۸)] تک میں دیکھئے۔

④ وفی ذلکم بلاء من ربکم عظیم۔

[وَ] مستانفہ ہے۔ کیونکہ یہاں سے ایک الگ مستقل جملہ شروع ہوتا ہے۔

[فی ذلکم] حرف الجر (فی) اور مجرور (ذلکم) مل کر خبر مقدم کا کام دے رہے ہیں۔ (ذلکم = "ذلك" ہی ہے جس پر کاف خطاب لگ گیا ہے۔ اس پر ابھی اوپر حصہ "اللغۃ" میں بات ہوئی تھی)

[بلاءٌ] مبتدأ مؤخر نکرہ ہے (جار مجرور یا ظرف خبر کا کام دیں تو وہ مقدم اور ان کا مبتدا نکرہ ہو کر

مؤخر آتا ہے۔مبتدا کے نکرہ ہونے کے کچھ اور مواقع بھی ہیں جن پر حسب موقع بات ہوگی) ۔[من ربکم] میں مِن" حرف الجر ہے آگے" ربِّ " مجرور بالجر اور آگے مضاف بھی ہے اس لیے تخفیف بھی ہے علامتِ جر" ب" کی کسرہ (ـِ) ہے۔اس کے بعد ضمیر مجرور "کُمْ" مضاف الیہ ہے۔اس طرح یہ پورا مرکب جارّی (من ربکم) نکرۂ موصوفہ (بلاءٌ) کی پہلی صفت ہے جس میں" مِن" بیانیہ ہے۔[عظیمٌ] یہ"بلاءٌ" کی دوسری صفت ہے۔اور یہ مرکب توصیفی (بلاءٌ عظیم) مبتدأ مؤخر نکرہ ہے۔سلیس نثر اس عبارت کی یوں ہوگی" وفی ذلکم بلاءٌ عظیم من ربکم"۔یوں نثر میں" من ربکم" بلحاظ ترتیب (بلاءٌ کی) دوسری صفت بن جاتا ہے اصل قرآنی ترتیب میں یہ پہلے تھا اس لیے اسے صفتِ اوّل کہا تھا

● اس جملہ اسمیہ (وفی ذلکم ..... عظیم) میں" ذلکم" کا مشارٌ الیہ" یسومونکم سوء العذاب ..... نساءکم" (مندرجہ بالا ۲) کے مضمون کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔اور" واذ نجیناکم من آل فرعون" (آیت کا ابتدائی فقرہ اور" الاعراب" میں جملہ ۱) کو بھی ـــ پہلی صورت میں" بلاء" کا ترجمہ" آزمائش اور امتحان" ہی ہوسکتا ہے۔مگر دوسری صورت میں اس کا ترجمہ" انعام" ہوسکتا ہے (جو بلاءٌ حسنٌ کے معنی میں سے ایک ہے)۔ترکیب نحوی کی بناء پر عبارتِ زیر مطالعہ کے تراجم میں فرق پر ابھی اُوپر حصّہ"اللغۃ" میں مفصل بات ہو چکی ہے دیکھئے [۲ : ۳۲ : ۱(۹)]

④ واذ فرقنا بکم البحر فانجیناکم

[وَاِذْ] عطف اور ظرف ہے (دیکھئے اوپر جملہ ۱) [فَرَقْنَا] فعل ماضی صیغہ متکلم مع ضمیر تعظیم" نحن" ہے [بِکُمْ] جارّ (بِ) مجرور (کم) مل کر متعلق فعل (فرقنا) ہے۔اور یہاں "ب" بمعنیٰ "لِ" بھی ہوسکتی ہے اور سببیہ بھی (ترجمہ کا فرق حصّہ اللغۃ" یعنی ۲ : ۳۲ : ۱(۱۰) میں دیکھئے) [البحرَ] مفعول بہ (فرقنا کا) ہے اس لیے منصوب ہے علامتِ نصب آخری" ر" کی فتحہ (ـَ) ہے۔اس عبارت کی سلیس نثر یوں ہوگی :"واذ فرقنا البحرَ بِکُمْ"۔قرآن میں الفاظ کی اس قسم کی تقدیم و تاخیر اس میں ایک ادبی حسن اور ایک گونہ شاعری کا انداز پیدا کرتی ہے [فَاَنْجَیْنَاکُمْ] کی" ف" عاطفہ اور" انجینا" فعل ماضی صیغہ متکلم مع ضمیر تعظیم" نَحْنُ" ہے۔اور آخری"کُمْ" اس (فعل) کا مفعول بہ (ضمیر منصوب متصل) ہے۔یہاں فعل" انجینا"کو"ف" کے ذریعے پہلے فعل (فرقنا) پر عطف کیا گیا ہے اور یہ ترتیب کو ظاہر کرتا ہے یعنی" سمندر پھاڑنے" کے عمل کے بعد نجات دی۔

⑤ واغرقنا آل فرعون وانتم تنظرون۔

[وَ] یہاں بھی عاطفہ ہے جس سے مابعد آنے والے فعل (اغرقنا) کو سابقہ فعل (فرقنا) پر عطف کیا (ملا دیا) گیا ہے [آل فرعون] میں مضاف (آل) اور مضاف الیہ (فرعون) مل کر "اغرقنا" کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے علامت نصب "آل" (مضاف) کی "ل" کی فتحہ (ـَ) ہے جو بوجہ اضافت خفیف بھی ہے۔ اور کلمہ "فرعون" یہاں مجرور بالاضافہ ہے غیر منصرف ہونے کے باعث اس کی علامتِ جر آخری "ن" کی فتحہ (ـَ) ہے۔ [وَ] حالیہ ہے یعنی "درآنحالیکہ" یا "حالت یہ تھی کہ"۔ [انتم] ضمیر مرفوع منفصل یہاں مبتدأ ہے (اسی لیے مرفوع ضمیر لائی گئی ہے) [تَنْظُرُوْنَ] فعل مضارع صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اس میں ضمیر فاعلین "انتم" مستتر ہے۔ اور یہ پورا جملہ فعلیہ ہو کر "انتم" (مبتدأ) کی خبر ہے۔ اس لیے اس جملہ کو محلاً مرفوع بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ پورا جملہ اسمیہ (وانتم تنظرون) اپنے سے سابقہ جملے (واغرقنا آل فرعون) کے فاعل (نَحْنُ) یا مفعول (آلَ فرعونَ) کا حال ہے یعنی "ہم نے ڈبو دیا آل فرعون کو اس حالت میں کہ تم دیکھ رہے تھے" اسی لیے اس جملہ حالیہ (وانتم تنظرون) کا بامحاورہ ترجمہ "تمہارے دیکھتے (دیکھتے)" اور "تمہاری آنکھوں کے سامنے" بھی کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے حصہ "اللغۃ" [۲ : ۳۲ : ۱ (۱۴)]

۲ : ۳۲ : ۳ الرسم

زیر مطالعہ قطعہ میں (جو دو آیات پر مشتمل ہے) شامل تمام کلمات (جو پچیس کے قریب ہیں) کا رسم املائی اور رسم قرآنی (عثمانی) یکساں ہے۔ صرف دو کلمات (نجینکم اور فانجینکم) کا رسم عثمانی عام رسم املائی سے مختلف ہے اور اس کے ساتھ ہی دو کلمات (العذاب اور ذلکم) کے رسم کے بارے میں بھی ایک وضاحت ضروری ہے تفصیل یوں ہے:

● "نَجَّيْنٰكُمْ" اور "فَاَنْجَيْنٰكُمْ" جن کا رسم معتاد علی الترتیب "نجّیناکم" اور "فانجیناکم" ہے۔ رسم عثمانی میں یہ بالاتفاق ضمیر مفعول "کم" سے پہلے والے "نا" کے الف کے حذف کے ساتھ لکھے جاتے ہیں یعنی بصورت "نجینکم" اور "فانجینکم"۔ بلکہ اسی سے علمائے رسم نے یہ قاعدہ نکالا ہے کہ فعل ماضی کے صیغہ جمع متکلم کی ضمیر مرفوع متصل (ضمیر تعظیم ہو یا کسی اور فاعلین کے لیے) کے بعد جب کوئی ضمیر منصوب متصل مفعول بہ ہو کر آئے تو ضمیر کا "الف" ("نا" والا) لکھنے میں حذف کر دیا جاتا ہے ہاں اگر اس ضمیر (مرفوع متصل) کے بعد مفعول کوئی اسم ظاہر آ رہا ہو تو فعل ماضی کا یہ صیغہ باثبات الف (رسم املائی کی طرح) لکھا جاتا ہے[1] اس کی دو مثالیں اسی زیر مطالعہ قطعہ میں موجود ہیں یعنی

---

[1] دیکھئے المقنع (للدانی) ص ۱۷، شرح العقیلہ (للشاطبی) ص ۴۸۔

"فَرَقْنَا" اور "اَغْرَقْنَا" میں۔

● "ذٰلکم" (ذٰلِكَ کی طرح) رسم عثمانی اور رسم املائی (دونوں) میں بحذف الف بعد الذال لکھا جاتا ہے بلکہ یہ حذف رسم معتاد پر رسم قرآنی کے اثرات کا ایک مظہر ہے تفصیل کے لیے دیکھئے البقرہ: ۲ [۲:۱:۳ (۱)]

● "العذاب" بالاتفاق ان کلمات میں سے ہے جو قرآن میں ہر جگہ باثبات الف لکھا جاتے ہیں۔ دیکھئے البقرہ: ۷ [۲:۶:۳] کے آخر پر

۲:۳۲:۴ الضبط

اس قطعہ کے کلمات میں ضبط کے اختلافات کو کسی حد تک درج ذیل نمونوں سے سمجھا جا سکتا ہے

وَاِذْ ، اِذْ ، اِذْ / نَجَّيْنٰكُمْ ، نَجَّيْنٰكُمْ ، نَجَّيْنٰكُمْ /

مِنْ ، مِنْ ، مِنْ / اٰلِ ، ءَالِ ، ءَآلِ / فِرْعَوْنَ ،

فِرْعَوْنَ / يَسُوْمُوْنَكُمْ ، يَسُومُونَكُمْ ، يَسُوْمُوْنَكُمْ /

سُوْٓءَ ، سُوٓءَ ، سُوٓءَ / الْعَذَابِ ، اَلعَذَابِ ، اَلْعَذَابِ /

يُذَبِّحُوْنَ ، يُذَبِّحُونَ ، يُذَبِّحُوْنَ / اَبْنَآءَكُمْ ، ابْنَآءَكُمْ ،

اَبْنَآءَكُمْ ، ءَابْنَآءَكُمْ / وَيَسْتَحْيُوْنَ ، يَسْتَحْيُونَ ،

يَسْتَحْيُوْنَ / نِسَآءَكُمْ ، نِسَآءَكُمْ ، نِسَآءَكُمْ / وَفِيْ ،

فِي ، فِى ، فِے / ذٰلِكُمْ ، ذٰلِكُمْ ، ذٰلِكُمْ / بَلَآءٌ ،

بَلَآءٌ ، بَلَآءٌ / مِنْ ، مِن ، مِن / رَّبِّكُمْ ، رَبِّكُمْ /

عَظِيْمٌ ، عَظِيمٌ ، عَظِيمٌ / وَاِذْ فَرَقْنَا ، فَرَقْنَا ،

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

اشاریہ حکمت قرآن

جنوری تا دسمبر ۱۹۹۳ء (جلد ۱۲)

○

قرآنیات

احمد یار، پروفیسر حافظ

لغات و اعراب قرآن:

☆ قسط ۴۰:	سورۃ البقرہ (۲۷)	آیات ۳۸-۳۹	فروری ۹۳ء ص ۴۹
☆ قسط ۴۱:	سورۃ البقرہ (۲۷)	گزشتہ سے پیوستہ	مارچ / اپریل ۹۳ء ص ۴۷
☆ قسط ۴۲:	سورۃ البقرہ (۲۸)	آیات ۴۰-۴۱	مئی ۹۳ء ص ۳۹
☆ قسط ۴۳:	سورۃ البقرہ (۲۸)	گزشتہ سے پیوستہ	جون ۹۳ء ص ۵۵
☆ قسط ۴۴:	سورۃ البقرہ (۲۹)	آیات ۴۲-۴۴	جولائی ۹۳ء ص ۱۵
☆ قسط ۴۵:	سورۃ البقرہ (۲۹)	گزشتہ سے پیوستہ	اگست ۹۳ء ص ۲۸
☆ قسط ۴۶:	سورۃ البقرہ (۳۰)	آیات ۴۵-۴۶	ستمبر ۹۳ء ص ۴۷
☆ قسط ۴۷:	سورۃ البقرہ (۳۱)	آیات ۴۷-۴۸	اکتوبر ۹۳ء ص ۴۹
☆ قسط ۴۸:	سورۃ البقرہ (۳۲)	آیات ۴۹-۵۰	نومبر ۹۳ء ص ۲۶
☆ قسط ۴۹:	سورۃ البقرہ (۳۲)	گزشتہ سے پیوستہ	دسمبر ۹۳ء ص ۳۷

اسرار احمد، ڈاکٹر

مطالعہ قرآن حکیم (نشری تقاریر و دروس وغیرہ)

☆ سورۃ الانفال (آیات ۹-۱۰)	جنوری ۹۳ء	ص ۳
☆ سورۃ الانفال (آیات ۱۱-۱۲)	فروری ۹۳ء	ص ۳
☆ سورۃ الانفال (آیات ۱۵-۱۶)	مارچ / اپریل ۹۳ء	ص ۱۶
☆ سورۃ الانفال (آیات ۱۷-۱۹)	جون ۹۳ء	ص ۴
☆ سورۃ یونس (آیات ۴۱-۴۶)	اگست ۹۳ء	ص ۳
☆ سورۃ یونس (آیات ۵۰-۵۳) ۔	ستمبر ۹۳ء	ص ۳

☆ سورۃ یونس (آیات ۷۱-۷۴) — اکتوبر ۹۳ء — ص ۳
☆ سورۃ ہود (آیات ۱-۵) — نومبر ۹۳ء — ص ۳
☆ سورۃ ہود (آیات ۹-۱۱) — دسمبر ۹۳ء — ص ۳
قرآن کا قانون عذاب — مئی ۹۳ء — ص ۳
عظمت قرآن بزبان صاحب قرآن — جولائی ۹۳ء — ص ۵

شبیر بخاری
قصص القرآن: ایک تحقیقی مطالعہ (۱) — مارچ 'اپریل ۹۳ء — ص ۸۴
قصص القرآن: ایک تحقیقی مطالعہ (۲) — مئی ۹۳ء — ص ۳۱

قاسمی' مولانا اخلاق حسین
کتاب کے ساتھ حکمت اور حکم کی اہمیت — جون ۹۳ء — ص ۹

محمد اسحاق بھٹی
برصغیر کے تراجم قرآن کے بارے میں چند گزارشات — اگست ۹۳ء — ص ۷

محمد عثمان' ڈاکٹر
قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کے دلائل — ستمبر ۹۳ء — ص ۷

محمد امین
قرآن اور تخلیق کائنات — فروری ۹۳ء — ص ۱۷

اسلامی نظام حیات

احمد افضال' ڈاکٹر
غم اور خوف سے نجات: قرآنی تعلیمات کی روشنی میں (۱) — اکتوبر ۹۳ء — ص ۲۰
غم اور خوف سے نجات: قرآنی تعلیمات کی روشنی میں (۲) — نومبر ۹۳ء — ص ۱۷
غم اور خوف سے نجات: قرآنی تعلیمات کی روشنی میں (۳) — دسمبر ۹۳ء — ص ۲۷

شبیر حسین زاہد
حقوق انسانی: قرآن و حدیث کی روشنی میں (۶) — جنوری ۹۳ء — ص ۳۰

عابدہ خواجہ' پروفیسر ڈاکٹر
وراثت میں عورتوں کا حصہ — جولائی ۹۳ء — ص ۴۳

عبدالغفار حسن' مولانا
معازف و مزامیر کا شرعی حکم (۱) — اکتوبر ۹۳ء — ص ۷
معازف و مزامیر کا شرعی حکم (۲) — نومبر ۹۳ء — ص ۸
معازف و مزامیر کا شرعی حکم (۳) — دسمبر ۹۳ء — ص ۱۷

عبدالماجد
اسلامی ثقافت کے آئینے میں نوجوان نسل کا کردار (۱) — فروری ۹۳ء — ص ۷
اسلامی ثقافت کے آئینے میں نوجوان نسل کا کردار (۲) — مارچ' اپریل ۹۳ء — ص ۲۷
اسلامی ثقافت کے آئین میں نوجوان نسل کا کردار (۳) — مئی ۹۳ء — ص ۱۹

قاسمی' مولانا اخلاق حسین
ناموں کے بگاڑنے کا غلط رواج — مارچ' اپریل ۹۳ء — ص ۲۲
تواضع اور خاکساری' آیات قرآنی کی روشنی میں — جولائی ۹۳ء — ص ۴۹

محمد سجاد تتراوی' حافظ
اسلام کے نظام تعلیم میں مسجد کا کردار — جنوری ۹۳ء — ص ۴۹

محمد لطیف سلیمی' حافظ
اسلامی قانون اور خاندانی منصوبہ بندی — جون ۹۳ء — ص ۴۷

محمد یونس جنجوعہ
نقطہ نظر (مساوات مرد و زن) — مارچ' اپریل ۹۳ء — ص ۳۹
عورت کا دائرہ کار — ستمبر ۹۳ء — ص ۳۱
انّ البدعۃ تھدی الی المعصیۃ — دسمبر ۹۳ء — ص ۱۰

اسلامی معاشیات اور مسئلہ سود

بنوی' مولانا الطاف الرحمٰن
بیع مؤجل کی شرعی حیثیت (۲) — جنوری ۹۳ء — ص ۱۵

سعید الرحمٰن علوی
نقطۂ نظر (مولانا محمد طاسین اور مولانا بنوی کا علمی مناقشہ) — فروری ۹۳ء — ص ۳۵

محمد طاسین' مولانا
بحث و نظر (بیع مؤجل کی شرعی حیثیت) — جون ۹۳ء — ص ۳۵

سیرت و سوانح

سلیم الرحمٰن' پروفیسر
حضرت خنساءؓ' ایک نامور شاعرہ (۱) — جنوری ۹۳ء — ص ۵۷
حضرت خنساءؓ' ایک نامور شاعرہ (۲) — مارچ' اپریل ۹۳ء — ص ۶۵

عبدالرشید عراقی
شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۵) — جنوری ۹۳ء — ص ۳۷
سید احمد شہید بریلویؒ — ستمبر ۹۳ء — ص ۳۸

قاسمی' مولانا اخلاق حسین
حضرت سلطان المشائخؒ کی قرآن و حدیث پر گہری نظر — اکتوبر ۹۳ء — ص ۱۶
حضرت سلطان المشائخؒ کی تفسیر قرآن پر گہری نظر — دسمبر ۹۳ء — ص ۷

اقبالیات

عصمت جاوید' ڈاکٹر
عکس اسرار خودی (منظوم) — جنوری ۹۳ء — ص ۶۳

محمد رفیع الدین مرحوم' ڈاکٹر

"حکمت اقبال" کا قسط وار سلسلہ

☆ قسط ۴۶: خودی اور فلسفہ سیاست (۳)	جنوری ۹۳ء	ص ۷
☆ قسط ۴۷: خودی اور فلسفہ سیاست (۴)	فروری ۹۳ء	ص ۲۳
☆ قسط ۴۸: خودی اور فلسفہ سیاست (۵)	مارچ' اپریل ۹۳ء	ص ۴۷
☆ قسط ۴۹: خودی اور سوشلزم (۱)	مئی ۹۳ء	ص ۱۲
☆ قسط ۵۰: خودی اور سوشلزم (۲)	جون ۹۳ء	ص ۲۵
☆ قسط ۵۱: خودی اور سوشلزم (۳)	جولائی ۹۳ء	ص ۳۱
☆ قسط ۵۲: خودی اور سوشلزم (۴)	اگست ۹۳ء	ص ۱۷
☆ قسط ۵۳: خودی اور سوشلزم (۵)	نومبر ۹۳ء	ص ۱۵
☆ قسط ۵۴: خودی اور سوشلزم (۶)	اکتوبر ۹۳ء	ص ۳۳
☆ قسط ۵۵: خودی اور سوشلزم (۷)	جون ۹۳ء	ص ۲۵

تحریک رجوع الی القرآن ---- پیش رفت

اسرار احمد' ڈاکٹر

امریکہ میں قرآن حکیم کے انقلابی فکر کا فروغ	مارچ' اپریل ۹۳ء	ص ۳

انوار الحق چوہدری

سالانہ رپورٹ خط و کتابت کورس	جنوری ۹۳ء	ص ۴۵

عاکف سعید

حرف اول

○ قرآن کالج- مضامین کے انتخابات میں اضافی سہولت	جنوری ۹۳ء	ص ۲
○ قرآن فہمی کی مہم- رجوع الی القرآن کی جانب ایک مزید قدم	فروری ۹۳ء	ص ۲
○ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا اکیسواں سالانہ اجلاس	مارچ' اپریل ۹۳ء	ص ۲

خطوط و نکات

شبیر بخاری

علامہ شبیر بخاری کا مراسلہ	جولائی ۹۳ء	ص ۶۱

عبدالرشید ندوی
ملی کونسل۔ اصل حقائق — اکتوبر ۹۳ء — ص ۲۹

قاسمی، مولانا اخلاق حسین
دہلی سے مولانا سید اخلاق حسین قاسمی کا مکتوب — جولائی ۹۳ء — ص ۶

محبوب علی
علم تجوید کے فروغ کی اہمیت — مارچ، اپریل ۹۳ء — ص ۹۵

تعارف و تبصرہ

○ واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر ایک نئے مطالعہ کی روشنی میں — فروری ۹۳ء — ص ۴۸
تالیف: مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

○ سیرت البم — مارچ، اپریل ۹۳ء — ص ۹۶
تالیف: شاہ مصباح الدین کلیل

○ مکاتیب سر محمد اقبال بنام مولانا سید سلیمان ندوی — مئی ۹۳ء — ص ۶۳
مرتب: سید شفقت رضوی

○ علامہ اقبال اور مولانا محمد علی — مئی ۹۳ء — ص ۶۴
تالیف: ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری

○ ہندو پاک کے فقہی مکاتب اور اسلامی فرقے — مئی ۹۳ء — ص ۶۵
ترتیب: محمد عبدالرشید ندوی

○ خطوط سلیمانی — جولائی ۹۳ء — ص ۶۲
مرتب: ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری

○ نقوش حقانی — جولائی ۹۳ء — ص ۶۲
تالیف: حافظ محمد ابراہیم فانی

○ نماز برائی سے روکتی ہے؟ کیسے؟ — اگست ۹۳ء — ص ۴۲
از لطف الرحمٰن خان

○ کتاب فلاح — اکتوبر ۹۳ء — ص ۳۲
مولف: پروفیسر محمد منظور علی شیخ

○ چلڈرن قرآن سوسائٹی۔ ایک تعارف اکتوبر ۹۳ء ص ۴۵

حرف اول

حکمت قرآن کے ادارتی صفحات پر ہر ماہ حرف اول کے عنوان سے حافظ عاکف سعید صاحب کی تحریر شامل اشاعت ہوتی ہے۔

مضامین بزبان انگریزی

Ameenul Hasan Rizvi
Some errors in Abdullah Yusuf Ali's English translation of Holy Quran — Nov. 93

Amena Chaudry
Islam and Hijab
(Derived form Dr. Israr Ahmad's Status of Woman in Islam) — Aug. 93

Israr Ahmad, Dr.
Three - point Action Agenda for the Muslim Ummah — Dec. 93

Mary Walker
A World Where Womanhood Reigns Supreme — Sept. 93

بقیہ: غم اور خوف سے نجات

بھرپور بلکہ واحد طریقہ وہی رہ جاتا ہے جو قرآن حکیم کی مندرجہ بالا تعلیمات کے ذریعے ہمارے سامنے آیا ہے۔ یاد رہے کہ ان تعلیمات کا محض جان لینا کافی نہیں' بلکہ ان پر کسی نہ کسی درجے کا یقین بھی ضروری ہے۔ اگر ہمارا یقین کم ہے' تو ہمارا سکون بھی کم رہے گا' پھر جیسے جیسے ہمارا ایمان ترقی کرے گا' اس کے ساتھ ہی ہمارے ذہنی و قلبی اطمینان میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ بقول اقبال ؎

گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیال بیش و کم آزاد شو (رموزِ بے خودی)

غم اور خوف سے نجات کی کیفیت ------ کم یا زیادہ ------ ہم سب کو حاصل ہو سکتی ہے' بشرطیکہ ہم اپنے دلوں کے اندر ایمان و یقین پیدا کر سکیں۔ ○○

his total personality with the 'color of Allah'. A muslim has been commanded by Allah not only to pray and fast, but also to put in practice His injunctions with respect to the socio-politico-economic aspects of life. Islam does not allow in the least the modern secular approach in which religion is confined to one's private life and modes of worship. On no pretext whatsoever -- economic stringency, difficulties in interest-free monetary transactions, extravagant customary practices on marriage and other social occasions -- can a true and committed Muslim justify himself in indulging in non-Islamic behavior. This is the basic and foremost lesson that comes out so clearly and emphatically from this verse of surah Al-i-Imran for all those who aspire to live as a Muslim and die as a Muslim. (to be continued)

بقیہ: لغات واعراب قرآن

فَرَقْنَا / بِكُمُ، بِكُمْ / الْبَحْرَ، اَلْبَحْر، اَلْبَحْرَ / فَاَنْجَيْنٰكُمْ، فَاَنْجَيْنٰكُمْ، فَاَنْجَيْنٰكُمْ / وَاَغْرَقْنَا، اَغْرَقْنَا، أَغْرَقْنَا، أَغْرَقْنَا / آلَ (مثل سابق) فِرْعَوْنَ (مثل سابق)۔ وَاَنْتُمْ، وَأَنْتُمْ، أَنْتُمْ / تَنْظُرُوْنَ، تَنْظُرُوْن، تَنْظُرُوْنَ۔

بقیہ: معازف ومزامیر کا شرعی حکم

مشغلے میں زیادہ دلچسپی لے وہ احمق ہے' اس کی شہادت رد کردی جائے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر روح المعانی' ج ۲۱' ص ۱٦

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآنی اشارات' سنت کی تصریحات' "آثارِ صحابہ" "اقوالِ تابعین" اور "سلف صالحین" کا تعامل اس بات پر گواہ ہے کہ غنا اور اس کے آلات سے وابستگی اسلامی مزاج کے یکسر خلاف ہے۔ سوائے دو چار افراد کے ملت کا فیصلہ یہی ہے ----

﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ﴾ ———— ○○

the Quran instructs us to believe wholeheartedly and to bow in submission and obedience to God totally and completely. It allows no fragmentation of life. Taqwa is an all-embracing moral quality of the highest order. It manifests itself in an individual's whole way of thinking and in all his actions. The Quran emphasizes that the guidance given by Him cannot be split into parts -- the peripheral, less important ones to be followed, the fundamental more important ones to be put in cold storage. We can see with our own eyes in the lives of those who often enjoy great fame for their taqwa that they are so particular about the minor details of the Shariah that deviation from the secondary injunctions of their own juristic persuations is to them tantamount to heresy and threatened with hell-fire. But their neglect of the fundamentals of Islam e.g., prohibition of interest in business and concern for economic exploitation and social injustice in society etc., -- reaches such heights that they have turned the Muslim's entire life into a life of compromise and political expediency. They should be reminded of the warning that Allah gave to the Israelites thus:

> Do you believe in a part of the Scripture and reject the other? What else, then, could be the retribution of those among you who do this than they should live in degradation in the present life, and that on the Day of Resurrection they should be sent to the severest chastisement. (Al-Baqarah 2:85)

God-fearing attitude and consciousness must assert itself both in public life and in the inner denizens of private life. In case it is shallow and fake, it will be manifest only in the external veneer of living and conduct. Once the Holy Prophet (peace be upon him) pointed to his breast thrice and said that taqwa resides in here. If the heart of a man is enlivened by taqwa, it will permeate his entire being and dye

practise Islam themselves. Their own lives and conduct, far from being based on taqwa and iman, exhibit many deviations from Islamic principles. Unfortunately, they forget that the first thing that Islam demands from them is to lead their own lives as much as possible according to the dictates of the Quran and the Sunnah of the Prophet (peace be upon him).

The demand of the Quran as explained in the above lines is that **we are required to worship and love Allah with all our heart, and with all our soul, and with all our mind, and with all our strength. In Islam the religious concern is ultimate, it excludes all other concerns from ultimate significance; it makes them preliminary. The concern for Islam is to be unconditional, independent of any condition of character, desire or circumstance. The unconditional concern is total: no part of ourselves or of our world is excluded from it; there is no place to flee from it. The total concern is infinite: no moment of relaxation and rest is possible in the face of a religious concern which is ultimate, unconditional, total and infinite.**

The Quranic Verse:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً

Believers! Enter wholly in Islam....(Al-Baqarah 2:208) means exactly this. God demands that man should submit, without reservation, the whole of his being and life to His will. Man's outlook, intellectual pursuits, behavior, interaction with other people and all modes of behavior should all be completely subordinate to Islam. God does not accept the splitting up of human life into separate compartments, some governed by the teachings of Islam and others exempt. Whether seen from the point of view of Islam or taqwa (i.e. God-fearing attitude and God-consciousness)

the inner conviction of faith and the practice of Islam are essentially interdependent. God almost invariably mentions faith and righteous conduct together. Verbal profession of Islamic beliefs, though important in its own right, is not sufficient for supporting the edifice of an Islamic morality and way of life and for winning him salvation in the Hereafter. Just imagine the utter misfortune of a person whose soul is overtaken by death while he is committing a grievous sin and no time is left for him to repent and make amends. This situation can only be avoided by a Muslim who makes Islam the ultimate, paramount and all-time concern in his life.

First thing first. This, then, is the foremost and base-line practical step or action which a true Muslim has to undertake most earnestly. Without accomplishing this, he cannot fruitfully move on to the two higher steps of the action-agenda. Allah castigates the religious divines of the Jews with severest reproach on this account thus:

> Do you enjoin right conduct on the people, and forget (to practise it) yourselves, and yet you study the Scripture? Will you not understand. (Al-Baqarah 2:44)

This attitude (of double standards) is also conspicuously visible in our own present day Muslim society. Many a people deliver moving and passionate lectures to others on religion and moral rectitude. A large group of spiritual mentors is seen engaged in Islamic dawah activity across the Muslim world. High-quality first-rate academic papers are being written and published by a host of scholars in the Muslim lands. Yet on closer examination one regrettably find that most of these scholars, writers and mentors do not

Moreover the command given in a most emphatic style -- and see that you do not die save in the state of Islam -- is very significant and subtle. As a matter of fact no body knows as to how long he is going to live and where and in what conditions his death will take place. We often hear that a person travels in the morning to a certain place on a business or pleasure trip. His family members fondly expect him back after a few days, but instead in the evening of the very same day he left his house, his wife and children receive his dead body. This means that if a man firmly decides that death does not take him except in the state of submission and total surrender to Allah, he will have to be extremely and ceaselessly alert and see that not even a single moment of his life is spent in sinful activities. No body has any guarantee whatsoever that he is not to die at the time of indulging in sin and thus transgressing the limits set by the Quran and the Sunnah. Many Quranic verses and Hadith emphasize that an un-Islamic act cannot co-exist with iman, indeed to the extent that, at least while man is committing a sin, his iman leaves him. Let me here quote a very authentic hadith.

Abu Hurayra, Allah be pleased with him, says: Allah's Messenger, peace and blessings be on him, said: While one is committing fornication, he is not a believer; while one is stealing, he is not a believer; while one is taking liquor, his is not a believer; while one is plundering, as people look on, he is not a believer; while one is committing fraud, he is not a believer; so beware, beware! (Bukhari and Muslim).

Leaving aside for a moment the arguments of the jurists and theologians about iman and its relation to amal (actions), one must try to understand the matter in the light of the Quran. It becomes crystal clear from the Quran that

lives of self-restraint and righteousness to the highest possible degree.' And the Companions of the Holy Prophet (peace be upon him) amply acted upon this Divine injunction. However, on our part we should not absolve ourselves of this duty by underestimating our own capacities and capabilities. One should not deliberately forego the struggle for restraint and piety on the false (and self-deceiving!) pretext that he has not the required mental and physical strength. The All-Knowing Allah knows well how much strength and capability He has given to a person and he will be judged according to that measure.

Now let us discuss the second injunction contained in the verse: 'and see that you do not die except in the state of Islam.' What does 'Islam' literally mean? It means submission and surrender to God. Islam implies belief in the unity of God and the prophethood of Muhammad (peace be upon him). Anyone who testifies to this belief fulfils the legal requirement for entry into the fold of Islam. And this belief has very significant practical ramifications. The edifice of a complete Islamic life can only be built on a belief in God's unity (Tawhid) that permeates a man's entire personal and social life, and which is so strong that he considers himself and all that he possess as really belonging to God; he accepts Him as the sole rightful Owner, Object of worship, Receiver of obedience and Law-giver for himself as well as for the rest of the world; he considers Him the fountain-head of guidance, and is fully aware that disobedience to God or indifference to the divinely revealed law constitutes deviation from the right path of Islam. Indeed, controlling the baser promptings and desires of the self and always striving to act according to the dictates of the Quran and Sunnah of the Prophet is what Islam essentially means.

a Muslim is that he should have taqwa. Not only a person with taqwa scrupulously avoids things which are explicitly prohibited; he also hesitates from getting involved in affairs which are in any way dubious or worthless. His sense of duty makes him fulfil God's commands in a spirit of total submission. His fear of God causes a feeling of deep anxiety and agony whenever there is a possibility that he may be in danger of exceeding limits prescribed by God. Ensuring the discharge of his obligations towards God and towards his fellow-beings becomes his way of life; he shudders at the very thought of doing anything unjust and against the Islamic Sharia. He keeps a vigil on whatever his bodily limbs (arms, legs, eyes, ears, sexual organs) perform. He thinks himself accountable for all voluntary acts performed through them. Since, according to the Quran an angel always records whatever a man speaks out, a God-fearing man is vigilant about what he utters. This vigilance, control, concern and caution are the hall-marks of the taqwa-based attitude in life.

Again, the words which accompany and qualify the commandment for taqwa are immensely noteworthy: '..... as He should be feared.' While reciting this verse we generally take a cursory and cavalier view of these. How radically different was the attitude and response of the Companions of the Prophet when they came to know of this challenging demand! They became extremely perturbed by this and thought that it was impossible for one to fear God Almighty to the highest degree due Him. They, therefore, enquired the Prophet about this and got consolation from the words of Allah, Most Merciful and Most Compassionate: 'So fear God as much as you can ....' (Taghabun 64:15). On hearing this they were relieved of a terrible anxiety. 'Fear of God' combined with 'as much as you can' obviously means: 'lead

Ubai bin Kaab as to how he will define taqwa and what its essences is. Ubai bin Kaab, acclaimed by the Holy Prophet (peace be upon him) as a great scholar and reciter of the Quran, explained it in such a convincing and graphic manner that everyone of the Companions sitting in that meeting appreciated it favorably. The explanation given by him may be paraphrased like this: if a man has to cross a jungle with thorny bushes on both sides of the narrow track, he will take extreme care and tuck up his garments in order to avoid any harm to his clothes or to himself. This attitude of caution and care is to he called *taqwa*. Keeping this connotation of taqwa in view, let us first understand what iman or Islamic religions belief is. Iman signifies that a person has acknowledged the unity of Allah and believed in Him as the Creator and the Sustainer of the universe, one has testified the Day of Judgment, and finally, believed the messengership of Muhammad (peace be upon him). This tripartite belief entails crucially important practical imparative, which are in the words of the Quran:

(i) So, obey Allah, and obey His messenger; but if you turn back, the duty of our messenger is but to proclaim the message clearly and openly. (Taghabun 64:12)

(ii) So take and put in practice what the messenger assigns to you and deny yourselves that which he withholds from you... (Hashr 59:7)

(iii) Then guard yourselves against the Day when one soul shall not avail another; nor shall compensation be accepted from her, nor shall intermission profit her, nor shall anyone be helped. (Baqrah 2:123)

In a nutshell, the first and foremost demand of iman on

second may be necessary. But even here it is both fear and reverential awe of Allah. The first, on the other hand, is a feeling of which anyone should be ashamed. To respond to the call of Allah and His Messenger even after one has been smitten by injuries indicates that one fears God. Taqwa is indeed God-consciousness that makes a man righteous and pious. Steadfastness and perseverance in obedience and loyalty to God necessarily characterize the pious (i.e., a muttaqi). According to the Quran, taqwa is an all-embracing moral-cum-spiritual quality of the highest order: the inner driving force that keeps a Muslim on the right track.

Let us try to understand taqwa a little further. Taqwa does not merely imply any particular form, appearance or life-style. Rather, it is a state of mind and heart which no doubt does reflect in every aspect of life. It permeates the whole being of a true believer; it is not a mere veneer or outward show. Essentially it can be termed God-consciousness: man's awe of God, consciousness of his duty towards Him and an awareness of his accountability to Him: that the world is a phase of trial where God has sent man for a specified period of time; that God's decisions on the Day of Judgement on an individual's future in the Hereafter will depend on how he makes use of his energies and capabilities in the given period of time at his disposal in this world, how he deals with his fellow beings. A conscience which is fired by consciousness of God becomes alive. Man's sensitivity becomes sharp under this influence and avoids every thing that is against God's will. He starts examining him own thoughts and feelings to see what tendencies are being nurtured within him. He begins to scrutinize his life to find out what activities he is spending his time and energy in.

Once Hazrat Umar Farooq, the second Caliph, asked

and hypocrites are all mixed up. However, on the Day of Judgment, Almighty Allah will make a clear division between them and every body will be rewarded on the basis of his belief and deeds (:). In other words, in this world a man's being Muslim (i.e. his verbal attestation of the basic beliefs of Islam and outward actions) is all that matters; but in the Hereafter only true and sincere belief --'iman'-- and deeds performed solely for the pleasure of Allah will save one from the torments of hell-fire.

Turning now to the meanings of the verses, one notes that they address all who claim themselves to be believers and the first demand that is made is: 'Believers! fear Allah as much as He should be really feared'. This means that people with Islam are being commanded to be true believers and to have fear and awe of Allah to the utmost degree. The Arabic word taqwa is very meagerly transliterated in the English word 'fear'. Fear is obviously of many kinds:

(i) the abject fear of the coward;
(ii) the fear of child or an inexperienced person in the face of an unknown danger, more properly called dread;
(iii) the fear of a reasonable man who wishes to avoid harm to himself or to people whom he wishes to protect;
(iv) the reverence which is akin to love, for it fears to do anything which is not pleasing to the object of love.

The first is unworthy of man; the second is necessary for one spiritually immature; the third is a manly precaution against evil as long as it is unconquered; and the fourth is the seed-bed of righteousness and piety. Those mature in faith cultivate the fourth; at earlier stages, the third or the

Muslims in the legal sense in an Islamic state as they profess the oneness of Allah and prophethood of Muhammad (peace be upon him). That is why in the whole of the Quran we do not read even once the words يَاأَيُّهَا الَّذِينَ نَافَقُوا even though a complete Surah entitled 'Al-Munafiqun' (the hypocrites) deals with the wiles, plots and false pretexts of the dissemblers, whom the Holy Book likens to propped-up timbers. At other places the hypocrites and faint-hearted and weak-willed believers are described as a menace to military discipline, quislings under pressure and vacillators always guessing at their shifting fortunes. All those who profess to have *iman*, the Quran says, do not necessarily truly believe: many have diseases of weakness, feebleness or hypocrisy in their hearts:

> And some men there are who say: We believe in God and the Last Day; but they are not really believers ..... in their hearts is disease. (Al-Baqarah 2:8-10)

> The beduins say, We believe. Say: You do not (truly) believe, rather say, 'We have (outwardly surrendered' -- for faith has not yet entered your hearts. (Al-Hujurat 49:14)

> O Messenger, let them not grieve you those who vie with one another (in the way of) Kufur, from among those who say with their mouths 'We believe' while their hearts believe not. (Al-Maida 5:41)

So here in the world true staunch believers, weaklings

Surahs and not even once the expression يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا--(O Believers!)-- has been used in these Surahs. This way of address was employed in the Medinan period in which Muslims formally became a community. Thus this expression marked the formation of Muslim Ummah and Allah Almighty used these words while addressing all the members of the Islamic polity.

(ii) A major portion of Surah Al-i-Imran was revealed in the third year after Hijra, immediately after the battle of Uhud (Shawwal, H.3). If one tries to visualize, with the help of authentic historical accounts, the state of the Muslim Community at that time in Medina, one sees that the faith and belief of the community presented a wide spectrum. At the one end of that spectrum were true and staunch pious believers (among both Ansars and Muhajirs) the depth of whose inner certitude, unflinching belief and iman was fathomless, whereas at the other extreme were those who lacked firm commitment and dedication to Islam -- the vacillating and faint-hearted among the Prophet's followers. The highest degree of this attitude was exhibited by those whom the Quran terms as 'Munafiqun'-- (منافقون) people who had rancor or hate against the true Muslims and suffered from incredulity, impiety, shiftlessness and dissimulation. The important point to note, however, is that these people were never treated as a separate group: rather they were included among the Muslims and the address starting with the expressions يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (O believers!) also covered them. This point has far reaching implications. Even hypocrites are to be treated as

thus:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

How can a group or a collectivity proceed in the right direction unless its individual members act and behave in the right manner? If individuals do not conduct themselves on the prescribed lines, how can the group as a whole work appropriately and achieve its envisaged targets? It is quite logical therefore that in organizing a collective effort the individual person himself comes first. In the context of Islamic ummah's mission and goal, the first and foremost point is that an individual Muslim should realize as to what his religious obligations are. He should be quite clear as to what Islam demands and requires him to do: indeed, how to live his life on earth. Let me illustrate this point with the help of an example. Suppose a person has to ascend a platform which has three steps. The surest and safest way for him will be first to rise up to the first step, then to the second and finally to the last. If, on the other hand, he tries to jump at the top, he is most likely to fall down thus failing to achieve his target. The verses cited above similarly unfold before us three steps or stages through which Muslims should pursue their ummatic goal.

So let us then focus our attention on the first verse that reads:

> Believers! Fear Allah as He should be feared, and see that you do not die except in the state of Islam.

Here two points are noteworthy before we embark upon an in-depth analysis of the contents of the verse:

(i) Almost two-third of the Quran consists of Makkan

verses too have philosophical points of wisdom or theoretical hikmah, I shall mainly dilate upon the practical guidance provided by them. I personally believe that pure academicism or too much philosophical or critical acumen exercised in understanding a particular point quite often hide from the scholar the concrete and practical guidance contained therein. Moreover, what the Muslim Ummah as a whole needs today is a clear and precise perception of the religious obligations and imperatives and a resolve to act upon them in the right earnest.

* The first verse tells a Muslim very precisely and yet very comprehensively the obligations and duties which he has to fulfil and perform as a member of the Muslim Ummah: the priorities in the conduct of life and value-structure to be upheld during the course of life on earth.
* The second verse enlightens them about the thing which unites Muslim as a group and welds them into an Ummah (a religious fraternity): the instrument which turns them into a disciplined hizbullah i.e., the party of Allah.
* The third verse delineates the objective or goal of the Muslim Ummah in general and the aim or objective of the activist Islamic group or hizbullah in particular. In other words what is the mission and the target towards which it has to strive?

One can very easily see that there is a strong logical relation between these three points. Every organizational effort or collectivity depends ultimately upon the individual members: his existential commitment to the group's world-view and determination to act accordingly. Allama Iqbal has very forcefully expressed this very idea in a poetical verse

THREE-POINT ACTION-AGENDA FOR THE MUSLIM UMMAH

Dr. Israr Ahmed

(Translated into English by: **Dr. Absar Ahmad**)

Three Verses (102-104) of Surah Al-i-Imran are of immense significance as they contain in a nutshell the comprehensive three-point plan of action Muslims are commanded to undertake in order to attain terrestrial success and salvation and felicity in the Hereafter. English translation of the verses reads:

102. Believers! Fear Allah as He should be feared, and see that you do not die except in the state of Islam.
103. And hold fast, all together, to the Rope which Allah (stretched out for you), and be not divided among yourselves; and remember with gratitude Allah's favour on you, for you were once enemies and then He joined your hearts in love, so that by His Grace, you became brethren; and you were on the brink of the pit of fire, and He saved you from it. Thus does Allah make His Signs clear to you: that you may be guided to the right way.
104. Let there arise from among you a band of people (i.e., a party) who invite people to all that is good and enjoin the doing of all that is right and forbid the doing of all that is wrong. It is they who will attain true success and felicity.

These verses occur almost in the middle of the Surah Al-i-Imran and as such occupy a pivotal position in the numerous themes with which the Surah deals. As is commonly believed by Muslims, every single verse of the Quran contains both theoretical wisdom and practical guidance. Similarly, though the above mentioned three

قارئین نوٹ فرمالیں!

کاغذ کی قیمت اور طباعتی اخراجات میں مسلسل اضافے کے باعث
جنوری ۱۹۹۴ء سے ماہنامہ "حکمت قرآن" کے سالانہ زرتعاون اور فی شمارہ قیمت
میں اضافہ کیا جارہا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے :

اندرون پاکستان

قیمت فی شمارہ -/۶ روپے' سالانہ زرتعاون -/۶۰ روپے

بیرون پاکستان

بیرون پاکستان کے ڈاک خرچ میں یکلخت بے پناہ اضافے کے باعث آئندہ نرخنامہ یہ ہوگا :

☆ برائے سعودی عرب' کویت' بحرین' قطر	۴۵ سعودی ریال یا
متحدہ عرب امارات اور بھارت	۱۲ امریکی ڈالر
☆ برائے یورپ' افریقہ' سکنڈے نیوین ممالک اور جاپان وغیرہ	۱۶ امریکی ڈالر
☆ شمالی وجنوبی امریکہ' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ	۲۰ امریکی ڈالر
☆ ایران' عراق' اومان' مسقط' ترکی' شام	
اردن' بنگلہ دیش' مصر	۹ امریکی ڈالر

مینیجر سرکولیشن' ماہنامہ حکمت قرآن' ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن' لاہور